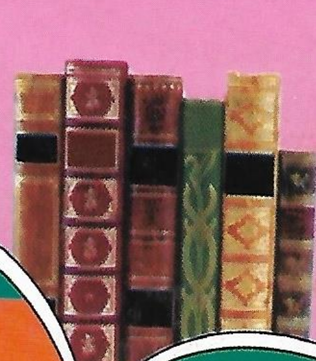
غلام مرتضیٰ راہی

حیات اور کارنامے

ڈاکٹر حسن نظامی



شمشیر نگر، جھریا، دھنباد (جھارکھنڈ)

غلام مرتضیٰ راہی

حیات اور کارنامے

(تحقیق و تنقید)

غلام مرتضٰی راہی

حیات اور کارنامے

(تحقیق و تنقید)

ڈاکٹر حسن نظامی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

GHULAM MURTAZA RAHI
HAYAT AUR KARNAME

By

Dr. Hasan Nizami

Year of Edition 2012
ISBN 978-93-5073-050-2
Price Rs. 250/-

نام کتاب	:	غلام مرتضیٰ راہی ۔ حیات اور کارنامے
مصنف/ناشر	:	ڈاکٹر حسن نظامی
نگراں	:	ڈاکٹر جلیل اشرف
سنہ اشاعت	:	۲۰۱۲ء
قیمت	:	۲۵۰ روپے
کمپوزنگ	:	سرفراز احمد (جھریا)
رابطہ	:	محمد حسن نظامی، شمشیر نگر، جھریا، (دھنباد) 828111

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

اردو اور انگریزی کے عالمی شہرت یافتہ

دانشور، ادیب، شاعر، مفکّر اور سائنس داں

جناب صفوت علی صفوتؔ

کے نام

معنون کرتے ہوئے

فخر و انبساط محسوس کرتا ہوں۔

ڈاکٹر حسن نظامی

فہرست مضامین

پیش لفظ

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط

ذی حیات شخصیات کو جامعاتی سطح پر تحقیق کا موضوع بنانا غیر مستحسن سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں سہل پسندی، ماخذات کی غیر معیاریت، سنی سنائی باتوں کے حوالے، متحقق شخصیت کے اثر و رسوخ اور تحقیقی مقالے کے غیر مکمل رہ جانے کا احتمال رہتا ہے۔ اس لیے ایسے موضوعات اکثر و بیشتر سرے ہی سے خارج کر دیے جاتے ہیں۔ لیکن بعض ایسی شخصیتیں ضرور ہوتی ہیں جن کے کارنامے تحقیق و تفحص کے متقاضی ہوتے ہیں۔ ان کا دائرۂ کار اتنا وسیع ہوتا ہے کہ اس کے ہر گوشے کو مناسب طریقۂ تحقیق کے بغیر تلاش کرنا دشوار ہوتا ہے۔ غلام مرتضیٰ راہی ایسی اہم شخصیتوں میں ایک ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کی شروعات گذشتہ صدی کے چھٹے دہے سے کچھ قبل ہی ہوئی تھی۔ کم و بیش نصف صدی پر محیط ان کے ادبی کارہائے نمایاں کو باقاعدگی سے منضبط کرنا اور انھیں تنقیدی کسوٹی پر پرکھنا ضروری تھا۔ ڈاکٹر محمد حسن نظامی نے اپنا تحقیقی مقالہ "غلام مرتضیٰ راہی: حیات اور کارنامے" لکھ کر اس اہم ذمہ داری کو بہ احسن طریقے سے نبھایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے قلم میں روانی عطا کرے۔ غلام مرتضیٰ راہی کو اس کتاب میں شاعر، خودنوشت نگار، ناقد اور دوست و اقربا پرور کی حیثیت سے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مصنف موصوف نے مذکورہ کتاب کو اس انداز سے ترتیب دیا ہے کہ راہی کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات کے تمام گوشے قارئین کتاب پر عیاں ہو جاتے ہیں اور کسی قسم کی تشنگی باقی نہیں رہتی۔

یہ کتاب نو ابواب پر مشتمل ہے۔ تعارف کے پہلے باب میں لائق مصنف، طویل تمہید کے بغیر ہی بالراست اپنے مقصد اصلی پر آ گئے ہیں اور راہی کے ذوقِ شاعری پروان چڑھنے کی مختصر روداد چند الفاظ میں بیان کر دینے کے بعد راہی کی شاعری میں ان کی شخصیت کے اثرات کا بتدریج جائزہ لیا ہے۔ اس ضمن میں مصنف نے خود شاعر کے ذاتی کوائف اور ان کے اپنے خیالات سے رجوع کیا ہے۔ مثلاً خود شاعر نے اپنی شعری تخلیقات کے متعلق یہ اظہارِ خیال کیا ہے کہ

"خوب سے خوب تر کی تلاش میں خود تر دیدی اور خود تنسیخ کا عمل میری زندگی اور میری شاعری میں جا بجا ملے گا۔"

کسی تخلیق پر تخلیق کار کی شخصیت کے اثرات کا مدلل جائزہ اس کی زندگی ہی میں ممکن ہوتا ہے۔ تخلیق کار کی عدم موجودگی میں صرف قیاس آرائیاں اور ناقدین کی آرا پر ہی اعتماد کیا جاتا ہے اور

وہی خیالات بطور دلیل استعمال ہوتے ہیں۔ظاہر ہے کہ ایسے دلائل میں اسقام اور غلطیوں کا در آنا عین ممکن ہے۔غالب کے فارسی ''معراج نامہ'' کے بعض اشعار کی قراءت و تفہیم کے لیے ناقدین ادب نے خود ان سے رجوع کیا تھا۔نکلسن کے کیے ہوئے ''اسرار خودی'' کے انگریزی ترجمہ میں راہ پائی غلطیوں کو خود اقبالؔ نے درست کیا تھا۔اگر مذکورہ کام ان شعراء کی عدم موجودگی میں کیے جاتے تو یقیناً ان میں موجود غلطیاں کبھی درست نہ ہوتیں۔ان مثالوں سے واضح ہوجاتا ہے کہ کسی فن پارے کے تنقیدی جائزے کے لیے فنکار کی موجودگی زیادہ سودمند ثابت ہوتی ہے۔اس اعتبار سے راہی کی زندگی میں ان کی تخلیقات پر کی گئی تحقیق و تنقید ان کی ادبی خدمات کا صحیح تعین قدر کرسکتی ہے اور ڈاکٹر حسن نظامی اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں جس کے عوض انھیں پی۔ایچ۔ڈی۔کی ڈگری تفویض ہوئی۔اسی باب میں انھوں نے راہی اور ان کے معاصر شعراء کے کلام کا موازنہ بڑے جامع انداز میں کیا ہے اور مختصر مگر ٹھوس مثالیں دے کر اپنے عندیے اور نتیجے کو واضح کیا ہے۔

دوسرا باب غلام مرتضیٰ راہی کے سوانحی خاکے پر مشتمل ہے۔اس ضمن میں مصنف نے راہی کی خود نوشت، مختلف رسائل میں چھپے ان کے مضامین، راہی کے احباب کی تحریروں اور خود راہی سے استفادہ کیا ہے اور ان کی زندگی کے تمام اہم گوشوں کو اُجاگر کیا ہے۔حسن نظامی نے اپنے مقالے میں راہی کے اُن ہی واقعاتِ زندگی پر روشنی ڈالی ہے جن کا تعلق بالراست ان کی ادبی سرگرمیوں سے رہا ہے۔اس باب میں مصنف نے راہی کے ابتدائی نثری تخلیقات پر بھی روشنی ڈالی ہے اور ان رسائل کی نشاندہی کی ہے جن میں وہ چھپی تھیں۔مشاعروں میں شرکت کے احوال اور راہی کے دوست شعراء کے واقعات بھی اس باب میں رقم ہوئے ہیں۔راہی کے ابتدائی دور کی سرگرمیوں کو سمجھنے میں یہ باب معاون ثابت ہوتا ہے۔اس باب میں راہی کے معاصر ادباء و شعراء سے ان کے مراسم اور مشغلوں کو بھی بڑے موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔دوست احباب پر راہی کی شخصیت کے اثرات کو بھی واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس باب میں کلام راہی پر معاصر ناقدین کی آراء بھی شامل ہیں۔

مقالے کا تیسرا باب غزل کی روایات میں راہی کی پاسداری کے لیے مختص ہے۔لائق مصنف نے قلی قطب شاہ سے لے کر حالیہ زمانے تک کی غزل کا اجمالی جائزہ لیا ہے۔غزل کے ارتقاء میں شامل مختلف رجحانات اور فن میں کیے گئے تجربات پر سیر حاصل بحث بھی کی ہے۔متصوفانہ، رومانی (عشقیہ) ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت جیسی تحریکات کے زیر اثر غزل کے فنی، اسلوبیاتی اور لسانی رویّوں میں ہوئی تبدیلیوں کا تجزیہ بھی کیا ہے۔مصنف نے میدانِ ادب میں پروان چڑھنے والے رجحانات کے اثرات سے راہی کی غزلوں میں ہونے والی تبدیلی

''غلام مرتضیٰ راہی۔ حیات اور کارنامے''

اور معاصر غزل گو شعراء میں ان کی انفرادیت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

چوتھے باب میں مقالہ نگار نے جدیدیت کے موجودہ تصور کے تناظر میں راہی کی غزلیہ شاعری کا تجزیہ کیا ہے اور مقالہ نگار اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ

''راہی نے کوئی مصنوعی طریقہ کار ایجاد نہیں کیا کہ اس میں خواہ مخواہ کی جدّت پیدا ہو، لیکن تراکیب، تشبیہہ، استعارے اتنے صاف وشفّاف کہ ان کی ہنرکاری کی داد دیے بغیر نہیں رہا جاتا۔ راہی کے یہاں جدیدیت کے غالب رجحانات میں تحیّر، واحد متکلّم اور فردیت پسندی کے عناصر جابجا بکھرے دکھائی دیتے ہیں۔''

کتاب کے مصنّف و محقق اپنی تحقیق کے دوران اس نتیجے پر بھی پہنچتے ہیں کہ جدیدیت پسندوں کے شعری منفی رویّوں سے ہٹ کر راہی نے مثبت رویّوں سے اپنی شاعری کو سنوارا ہے، جس کی وجہ سے ان کا شعری سرمایہ خوش شکل جدیدیت کا ایک بیش بہا اثاثہ فراہم کرتا ہے اور راہی کی یہی محنت انھیں جدیدیت پسندوں میں بھی منفرد بنا دیتی ہے اور ان کے درمیان راہی بلند قامت دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے جدیدیت کی جمالیات سے بھی خوشہ چینی کی ہے اور اس کے جمال سے اپنی غزل کے پیکر کو ایسا حسین وجمیل بنایا ہے کہ غزل جدیدیت و مابعد جدیدیت کی فضا میں رنگ ونور بکھرتی نظر آتی ہے۔ جدیدیت کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ اس میں روایتی معنی یکسر بدل دیے جاتے ہیں۔ راہی کے یہاں یہ خوبی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ مصنفِ کتاب نے مثالیں دے کر اس کی وضاحت کی ہے۔

پانچویں باب میں مصنف نے راہی کی شاعرانہ ذہنیت سے متعارف کرایا ہے۔ محقق راہی کے کلام کے تجزیے و تحلیل کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ راہی کے یہاں مذہبی شعور کی فراوانی ہے۔ ان کے مجامع کلام کے عنوانات ہی سے پتہ چلتا ہے کہ ''توحید'' کے وہ پرستار ہیں۔ ان کی ابتدائی نظموں میں بھی مذہب کا رنگ غالب رہا تھا۔ مذہب کے بعد قومیت اور وطن پرستی کی طرف ان کا رجحان رہا ہے۔ راہی نے بعض منظومات اور غزلیں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر بھی لکھی ہیں، جن میں غربت اور افلاس کے خط کے نیچے زندگی بسر کرنے والے لوگوں کی بدحالی کا ماتم اور نوحہ ہے، ان نظموں میں شاعر ''انقلابِ نو'' کا حامی نظر آتا ہے۔ راہی کی ذہنیت کو ان کے کلام کے حوالے سے جن ناقدین اور محققین نے ٹٹولا ہے، ان کی آراء سے مصنف نے نہ صرف یہ کہ استفادہ کیا ہے بلکہ انھیں نقل کر کے اور ان کا تقابلی جائزہ لے کر راہی کی ذہنیت کو پرکھنے کی سعی بھی کی ہے۔

چھٹا باب راہی کے استعمال شدہ صنائع بدائع پر مشتمل ہے۔ راہی کے کلام میں تشبیہات واستعارات کی انفرادیت کو اس میں تلاش کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر محمد ادریس رضوی کی کتاب

"غلام مرتضیٰ راہی۔حیات اور کارنامے"

"کلام راہی اور صنائع بدائع" بڑی معتبر ہے۔ مصنف نے اس کتاب کے علاوہ ملک کے معتبر ادیبوں اور ناقدوں کی آراء اس باب میں شامل کرلی ہیں۔ انھوں نے راہی کے کلام میں مستعمل استعاراتی زبان کی داد دی ہے، 'پتھر'، 'دیوار'، 'آئینہ'، 'دریا' وغیرہ ایسے استعارے راہی کے کلام میں ملتے ہیں جن سے اشعار میں شامل الفاظ کی معنویت یک لخت تبدیل ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہ استعارے کلامِ راہی میں تحیّر و تجسس پیدا کردینے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

ساتواں باب، غلام مرتضیٰ راہی کے امیج کی وضاحت کے لیے ہے۔ معاصر ناقدین و شعراء کی آراء کی روشنی میں لائق مصنف نے راہی کے امیج کا تجزیہ کیا ہے۔ مجھے یہ باب کچھ کمزور محسوس ہوا ہے یا یہ کہ اس باب کا عنوان واضح نہیں ہے۔ اس کی ترتیب میں مصنف نے مختلف ادیبوں کی آراء راہی اور کلام راہی کے متعلق جمع کی ہیں، جن سے راہی کے متعلق ان معاصر ادباء و شعراء کی امیج واضح ہوتی ہے۔ ان آراء کی روشنی میں جدید شعراء کی بھیڑ میں راہی بہ آسانی پہچانے جاتے ہیں۔ اس باب میں مصنف نے راہی کے مجموعوں پر کیے گئے تبصروں، ان کے کلام پر لکھے گئے مضامین اور ان کی شاعری پر لکھی گئی تنقیدی کتابوں سے بھی مدد لی ہے۔

مصنف نے آٹھویں باب میں اردو کے عظیم غزل گو شعراء کے درمیان راہی کے مقام کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے راہی کے ذہنی انسلاک کو میر و غالب تک پہنچایا ہے اور غزل کی اس روایت کو اپنا کر اپنی تخلیقات میں معاصر شعراء کے بالمقابل نیا پن لانے کی کوشش میں اپنا مقام راہی نے کہاں بنوایا ہے، مصنف نے اس کو دسیوں دلائل سے ثابت کیا ہے۔ راہی کے معاصر شعراء کے کلام سے راہی کے اشعار کا تقابل و موازنہ بھی اس باب میں نہایت دقت نظری سے کیا گیا ہے۔ بانی، زیب غوری، بشیر بدر، مصور سبزواری، ظفر اقبال، بشر نواز، وغیرہ شعراء کے کلام کو اس ضمن میں استعمال کیا گیا ہے۔ آخر میں راہی کے مقام کا تعیّن کرنے کے لیے جو نتیجہ محقق موصوف نے اخذ کیا ہے وہ کچھ اس طرح کا ہے۔

> "میں اپنے مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ غلام مرتضیٰ راہی ایک رجحان ساز جدید شاعر ہیں۔۔۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ راہی کا جدید غزل گو (شعراء) میں ارفع و بلند مقام ہے۔۔۔ راہی کو غالب کی ذہنیت سے علاقہ رکھنے والا شاعر قرار دیتے ہوئے بانی، زیب غوری اور مصور سبزواری کی صف میں رکھا جانا چاہیے۔ راہی کے حوالے کے بغیر نئی غزل کی تاریخ مرتب نہیں کی جا سکتی۔"

یہ کتاب یقیناً جدید غزل پر تحقیق کرنے والوں کے لیے حوالے کی کتاب بن سکتی ہے۔

حرفے چند

ڈاکٹر حسن نظامی

شعر وادب میں تحقیق کی روایت بہت پرانی ہے۔ تحقیق سے ہم ادبی سرمایے کی نہ صرف قدر و قیمت کا اندازہ لگاتے ہیں بلکہ ہم اپنے اسلاف کے تخلیقی کارناموں کی از سرِ نو بازیافت بھی کرتے ہیں۔ اس سے نہ صرف ادب کا سرچشمہ رواں رواں رہتا ہے بلکہ تحقیق و تدوین کا معیار بھی بلند ہوتا ہے۔ بابِ شعر میں کسی عظیم شاعرانہ شخصیت پر جب تحقیقی کام شروع ہوتا ہے تو اس کے پس منظر میں وہ ساری باتیں سمیٹنے کی کوششیں کی جاتی ہیں جو تحقیق طلب ہوتی ہیں۔ چونکہ میں شروع سے ہی ادب کا ایک سنجیدہ طالب علم رہا ہوں اس لیے میری نگاہ روایت، ترقی پسندی اور جدیدیت یعنی تینوں مختلف النوع صورت حال کی شاعری پر رہی ہے۔ بذات خود میں مابعد جدید عہد کا ایک شخص اور شاعر ہوں اس لیے اپنے پیشرووں میں بلند مرتبت شعراء کے چہرے ذہن میں موجود رہے ہیں۔ میرے لیے ان میں بعض چہروں کی شناخت اس لیے مشکل بنی رہی کہ ان کا شعری خدوخال واضح ہو کر بھی میرے لیے دُھند کی کیفیت پیدا کرتا رہا۔ تب میری نگاہ کی کرید نے ایک ایسی چنگاری کا دیدار کیا جو میرے ذہن ودماغ کے چودہ طبق روشن کرنے کے اسباب وعلل بن کر سامنے آئے۔ میری مراد جناب غلام مرتضٰی راہیؔ سے ہے۔ یہ اردو غزل کا ایک ایسا نام ہے جو نصف صدی سے اُفقِ ادب پر نیّرِ تاباں کی طرح چمک دمک رہا ہے۔ میں نے جب ''غلام مرتضٰی راہیؔ۔ حیات اور کارنامے'' کے موضوع پر تحقیق کرنے کے ارادے کا اظہار مرحوم خورشید جہاں صدر شعبۂ اردو ونوبا بھاوے یونیورسٹی، ہزاری باغ کے سامنے کیا تو انھوں نے نہ صرف تحقیق کے موضوع کی انفرادیت واہمیت کا اعتراف کیا بلکہ اس اچھوتے موضوع پر دل جمعی سے کام کرنے کی نصیحت بھی کی۔ اپنے گائیڈ کی دلچسپی نے میری فطری ذکاوت کو پروان چڑھانے میں محرّک کا کام کیا اور میں تندہی سے تقریباً تین برسوں میں ریسرچ مکمل کر کے یونیورسٹی

میں جمع کر دیا۔ چونکہ میں نے تحقیق کی سبھی شرطوں کی تکمیل بحسن وخوبی کی تھی اس لیے میرے کرم فرما ممتحن ڈاکٹر وہاب اشرفی کے ہاتھوں ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے سرفراز ہونے کا موقع میسّر آ گیا۔

ان دنوں تحقیقی کا معیار تیزی سے گرتا جارہا ہے۔ محققین ''چلے بھی دو قدم نہیں نشان مانگنے لگے'' کی روش پر گامزن ہیں۔ میں اس پر مزید رائے زنی نہیں کرسکتا کہ اس کا محل نہیں ہے لیکن میں اپنی تحقیق کے انفرادو معیار سے مطمئن ہوں۔ کتابی صورت میں اس کی اشاعت کی غرض وغایت یوں بیان کی جاسکتی ہے۔

۱۔ کتابی صورت میں شائع ہونے سے راہی شناسی کی راہ ہموار ہوگی۔

۲۔ غلام مرتضیٰ راہی کے ساتھ ان کے معاصرین کا تقابلی مطالعہ لائقِ مطالعہ حصّہ ہے۔ اس سے ان کی شاعرانہ انفرادیت کا پتہ چلے گا۔

۳۔ غلام مرتضیٰ راہی کے شعری ونثری کارنامے سے لوگ آگاہ ہوں گے۔

۴۔ غلام مرتضیٰ راہی کی غزلوں کی جہت کے روشن ہونے مستقبل میں بھی ریسرچ اسکالروں کو اس سے کافی مدد ملے گی۔

۵۔ راہی کی شاعری اردو شعروادب کا عظیم سرمایہ ہے اسے محفوظ رکھنے میں یہ کتاب بے حد معاون ہوگی۔

امید قوی ہے کہ میری ان معروضات کی روشنی میں کتاب کو مطالعے کی میز پر ضرور رکھا جائے گا۔ اِس تحقیق کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں میرے گائیڈ ڈاکٹر جلیل اشرف نے ہر مشکل امر کو آسان کرنے میں میری مدد فرمائی۔ استادِ محترم ڈاکٹر رونق شہری نے مجھے موضوعات کے ساتھ انصاف کرنے کا گُر سکھایا۔ ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے مفید مشوروں سے میرے حوصلے اور عزم کو جلا بخشا۔ پروفیسر عامر مصطفیٰ اور ڈاکٹر زین رامش کے محبانہ سلوک نے دشوار مرحلوں کو آسان کیا۔ ناسپاسی ہوگی اگر ان حضرات کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر یحییٰ نشیط صاحب کا شکریہ ادا نہ کروں۔ موصوف نے میرے تحقیقی مقالے پر وقیع ومؤقر پیش لفظ قلم بند کیا۔ نیز میری کاوش کو کھلے دل سے سراہا۔

باب نمبر ا۔

تعارف

روایت، ترقی پسندی سے ہٹ کر جن جدیدیت پسند شعراء پر نظر پڑتی ہے ان میں ایک بڑا اور اہم نام غلام مرتضٰی راہی کا ہے جو ایک قادرالکلام اور بالکل نئ جہت کے شاعر ہیں۔ غلام مرتضٰی راہی کی شاعری سچی شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ شعر کہنے کی نفسیات میں وہ خود موجود رہتے ہیں۔ راہی کی غزلوں میں ایک تہہ داری اور فکری دبازت نمایاں ہے۔ زندگی کے کرخت اور بے رحم مناظر کو ہو بہو پیش کرنے کا فن راہی کو بخوبی آتا ہے۔ شعراء کرام کی اتنی لمبی جماعت میں ان کا قد بہت اونچا دکھائی دیتا ہے۔ وہ ایک انفرادی اور باوقار شخصیت کے حامل نظر آتے ہیں۔ انہوں نے غزل میں نادرہ کاری سے غزل کی تفہیم میں معاونت کی ہے ان کے کلام میں صنائی ہے اور تازہ کاری بھی۔ ان کے مجموعوں میں غزل کی متانت کو نئ لفظیات کی تلاش کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی بڑی خوش آئند کوشش کی گئی ہے۔

غلام مرتضٰی راہی نے اپنی شاعری کی شروعات ۱۹۶۴ء سے کی ہے لیکن شعر موزوں کر لینے کا ہنر ۵۴-۱۹۵۳ء میں ہی حاصل ہو گیا تھا۔ ان کا ذہن اسے قبول کرنے کے لئے پہلے سے ہی تیار تھا کیونکہ ان کے خاندانی بزرگوں میں شعر کہنے اور سننے کا ذوق تھا۔ راہی کے دادا محمّد رمضان خاں غوری نہایت خوش الحان اور میلاد خواں تھے۔ صوفیانہ قوالیوں سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ اکثر یہ شعر گنگنایا کرتے تھے جو کہ خواجہ

غریب نواز کے کسی عرس میں سن رکھا تھا۔

مدینے جا کے رسول خدا سے کہہ دوں گا
کہ مجھ غریب کی سنتے نہیں غریب نواز

راہیؔ صاحب کے والد محترم غلام مصطفیٰ خاں کو بھی شعروشاعری اور مطالعے کا ذوق تھا۔'انجمن انہار' میں ان کا کلام شائع ہوا کرتا تھا۔نوکری سے سبکدوشی کے بعد وہ مقامی شعری نشستوں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ فتح پور میں بشیر بدر اور محمد طاہر صاحبان کے یہاں پابندی سے شعری نشستیں ہوا کرتی تھیں جن میں راہی صاحب جایا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ شعر گوئی کی لت انہیں بھی لگ گئی۔ انہوں نے شاعری اس وقت شروع کی جب غزل اپنے کینچل سے باہر آ چکی تھی۔ ہر موضوع پر اشعار لکھے جانے لگے تھے۔ یہ صرف محبوب کی زلفوں کی گرہ گیر نہ رہ کر مفلسی، بیچارگی اور روزمرہ کے حالات کی زندہ جاوید تصویر بن گئی تھی۔ کسی بھی صنف میں اپنی باتوں کا اتنا دلکش اظہار نہیں ملتا جتنا کہ غزل میں گنجائش ہوتی ہے۔ دو مصرعے میں ہر پہلو کو روشن کر دینے کا ہنر غزل کو ہی آتا ہے۔ زمانے کی ڈوبتی ہوئی رگوں میں زندگی کی علامتیں سرایت کرنے کی صلاحیت غزل میں آ گئی تھی۔ اشارے، کنائے، صنعت و بلاغت اور استعارے غزل کو خوبصورتی عطا کر رہے تھے۔ ابتداء میں راہیؔ ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے اس لئے نظموں کی طرف راغب ہوئے۔ ترقی پسند ادبی تحریک جس نے پورے ملک کے ادباء وشعراء کو ایک مخصوص نظریاتی پلیٹ فارم پر لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ غزل سے متعلق کلیم الدین احمد کی رائے کے وہ حمایتی تھے لیکن بہت جلد انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور انھوں نے 'لامکاں' (۱۹۷۱ء) اور 'لاریب' (۱۹۷۳ء) کے وسیلے سے اردو ادب میں غزل کی صنف کو تازگی بخش کر اپنی غلطی کا ازالہ کر لیا۔ ان کی کئی پیاری اور انقلابی نظمیں مختلف جرائد میں شائع بھی ہوئیں۔ راہیؔ نے غزل میں نئی جہت

نئے رجحانات اور نئے انداز فکر کی داغ بیل ڈال کر بہت جلد اردو حلقے میں اپنا مقام مستحکم کرلیا تھا۔ پھر اچانک ۱۹۸۰ء کے بعد اردو دنیا سے پندرہ برسوں تک گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ ایسا کیوں ہوا یہ ایک تحقیق کا موضوع ہے۔

مارکسی اور اینگلز کے مطابق ادب کی تحقیق کے لئے تاریخی شعور کو سمجھنا ضروری ہے۔ تاریخی شعور ہمیں یہ بتاتا ہے کہ زندگی بر ابر اپنے ارتقا کی طرف بڑھتی رہتی ہے۔ معاشی اور سیاسی نظام میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور ان تبدیلیوں کا اثر فنکار اور ادیب کی سوچ وفکر پر بھی پڑتا ہے۔ راہی نے بھی اپنی شاعری میں انقلاب برپا کرنے کی خاطر پندرہ برسوں تک ادبی پس منظر سے غائب رہ کر تاریخی شعور حاصل کرلیا تھا۔ اس طویل خاموش سفر کے باوجود وہ اپنی راہ سے بھٹکے نہیں، خود کو سنبھالے رکھا کیوں کہ شعری در وبست پر شروع سے ہی ان کی گرفت مضبوط رہی ہے۔ وہ خاموش رہ کر بھی مکروہاتِ زمانہ کا مطالعہ کرتے رہے اور جب ۱۹۹۵ء میں ان کی دوبارہ واپسی ہوئی تو ادبی دنیا نے انھیں پھر ہاتھوں ہاتھ لیا۔ شاعری میں بے باکی اور حیرت ناکی کھل کر سامنے آگئی۔ غالبؔ نے بھی اس کا انکشاف کیا تھا کہ طبع کے رکنے سے مزید روانی پیدا ہوتی ہے۔ ''رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور''۔

راہی کے اکثر شعر قاری کو چونکانے لگے۔ عہد حاضر کے بہت بڑے مفکر و ناقد شمس الرحمٰن فاروقی یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ ''غلام مرتضٰی راہیؔ کے تازہ کلام میں پہلے سے زیادہ تہہ داری ہے اور یہ بات مناسب بھی ہے کہ شاعر اگر ارتقا کرے تو گہرائی کی طرف جائے۔ راہیؔ کی نئی غزلوں میں آہنگ کا تنوع گذشتہ مجموعوں سے زیادہ ہے۔ ان کے یہاں آہنگ میں وہ نرم روی تو کبھی نہ تھی جسے بعض لوگ غزل کے لئے ضروری جانتے ہیں اب جو تنوع ہے اس میں کھردرے پن اور بے یقینی کی جگہ نئے لہجے دریافت کرنے اور نھیں کامیابی سے سنبھالے جانے کا اعتماد بھی ہے۔ ایسی عمر میں جب اکثر

شاعر تھک کر بیٹھ چکے ہوتے ہیں۔غلام مرتضیٰ راہیؔ نئے مرحلے تسخیر کر رہے ہیں۔

غلام مرتضیٰ راہیؔ اپنے اوائل عمری سے ہی کافی حساس طبیعت اور متجسس ذہن کے واقع ہوئے ہیں ان کی شاعری میں پختگی کی ایک خاص وجہ یہ بھی رہی ہے۔ کہتے ہیں ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ہوتے ہیں۔ یہ غلام مرتضیٰ راہیؔ پر بالکل صادق آتا ہے۔وہ اپنے احباب کے ہمراہ ہوتے لیکن خیال کا سمندر کہیں دور وادیوں میں موجیں مارتا ہوا خاموشیوں کی سرحدیں پار کر جاتا۔انہیں اسکول یا گھر، بازار ہو یا محفلیں ہر جگہ تنہائی کا گمان ہوتا تھا۔ جب گاؤں میں ہوتے تو وہاں کے مناظر لطف اندوز ہوتے، اپنے حلقہ پڑوس کے جانوروں کے حرکات وسکنات کو بغور دیکھتے۔ سبزے پر پھیلی اوس کی بوندوں پر ننگے پاؤں چلتے،کبھی دوڑ لگاتے، پھولوں کی خوش رنگینیوں سے لطف اندوز ہوتے، درختوں کی ڈالیوں کو جھکاتے، پھولوں کو توڑتے اور فطرت کے دلکش مناظر کو اپنی روح میں بسا لیتے۔کھیتوں میں رہنٹ کا چلنا اور چھوٹی چھوٹی ڈولچیوں سے پانی کا اوپر آنا اور کیاریوں میں پانی کا بکھر جانا۔ان مناظر سے وہ گھنٹوں محظوظ ہوا کرتے تھے۔نازک مزاجی کا یہ حال کہ وہ کسی جانور کو ذبح کرتے دیکھ لیتے تو انہیں ہرگز اپنا لقمہ نہیں بناتے۔غلام مرتضیٰ راہیؔ اپنے بچپن کے ایاّم میں جب اسکول کی چھٹیوں میں فتح پور سے کنور پور (جو کہ آبائی وطن تھا) جاتے تو اپنے دادا محترم کے صندوق سے کہانیوں کی کتابوں کے علاوہ ٹن (Tin) کے چونگا سے شجرۂ حسب نسب نکال کر بڑے اشتیاق کے ساتھ دیکھا کرتے تھے۔ راہی صاحب کے دادا محمّد رمضان خاں غوری کے پاس لکڑی کا ایک بڑا صندوق تھا جس میں وہ دینی کتب و رسائل، قصص الانبیاء کے نسخے، داستانِ حمزہ کی جلدیں اور ایک ٹن کا بوسیدہ حال چونگا رکھتے تھے۔ چونگا کے اندر ایک چکنی شیٹ پر ان کے اسلاف کا شجرۂ حسب نسب نقش تھا۔ بعد میں یہی ساری کیفیتیں ان کے تخیل کے کینوس پر تصویر بن کر ابھرنے لگیں۔کم

سنی میں ہی لوگ ان کی ذہانت کے قائل ہو گئے تھے۔ ہائی اسکول کے اردو پروگراموں میں ان کی حصہ داری ضرور ہوا کرتی تھی۔ بیت بازی، بحث و مباحثہ اور ڈرامے میں اداکاری کے لئے پیش پیش رہا کرتے تھے۔ یہ اتنے ذہین تھے کہ ہائی اسکول اور بی۔ اے۔ میں اپنے ہم جماعت طالب علموں کو ٹیوشن پڑھایا کرتے تھے۔ بی۔ اے کے امتحان کے فوراً بعد ہی روزنامہ 'سیاست جدید' میں معاون مدیر کی حیثیت سے کام کرنے لگے جہاں غفران زاہدی اور جمیل اختر نعمانی نے آئینۂ صحافت پر پڑی دھول ہٹا کر دنیا کو ایک روشن ستارہ سے روشناس کرایا۔ اخباری ضرورتوں کے تحت ملک گیر اسفار سے ان کے مشاہدات و تجربات میں مزید اضافہ ہوا اور تخیلات کی دنیا وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی۔

فطرت سے جذباتی اور والہانہ لگاؤ کا شعری اظہار ان کی شاعری مین رچا بسا ہے۔ ان کے بچپن کا زیادہ حصہ دیہی ماحول میں گزرا، اس لئے کھیت، کھلیان، سبزے، ندی، نالے، جھرنے، جنگل، پہاڑ، چرند، پرند سبھی ان کی شخصیت کے فروغ میں کافی معاون رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی خودنوشت ''منظور ہے گذارش احوالِ واقعی'' میں اس امر کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

''قدرتی ماحول میں انفس و آفاق کی معنوی درشتگی کے مشاہدے اور ان کے اثر ونفوذ سے مجھے زندگی ایک جدلیاتی حقیقت نظر آنے لگی تھی اور کوئی شک نہیں کہ تصادم و بیکار سے میری زندگی کو نمو اور بالیدگی ملتی رہی۔ خوداعتمادی، خودسری، عزم و سرکشی، جہد پیہم اور حالات سے مفاہمت کرنے کے بجائے ستیزہ کاری کا سبق میں نے نیچر ہی سے سیکھا۔ میری انا اور خودی کے شیش محل پر نامساعدت کی ضرب پڑتی رہی مگر میں ٹوٹ بھوٹ کر بھی حلقۂ تجسیم میں رہ کر اپنی تشکیل نو میں مصروف رہا۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں خودتردیدی اور خودتنسیخ کا عمل میری زندگی اور میری شاعری میں جابجا ملے گا۔''[1]

---

[1] منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی۔ غلام مرتضیٰ راہی مطبوعہ سہ ماہی 'رنگ' دھنباد شمارہ نمبر ۲۶، جون ۲۰۰۴ء

غلام مرتضیٰ راہیؔ بذاتِ خود ایک اچھے انسان ہیں۔ان سے جسے بھی شرف ملاقات میسر ہوا اس نے ان کی تعریف کی جس نے خطوط بھیجے اس کا اسے جواب ملا۔وہ کسی کو مایوس کرنا نہیں چاہتے۔یہ ان کی فطرت میں شامل ہے۔میری کوئی ادبی حیثیت نہیں لیکن جب میں نے بذریعہ فون رابطہ کیا بڑے ہی پرتپاک اور پرجوش لہجے میں گفتگو فرمائی۔ٹھیک کہا گیا ہے کہ ثمر دار درخت جھکا ہوتا ہے۔غلام مرتضیٰ راہیؔ ادبی خطہ ارض کے تناور اور ثمر دار درخت ہیں۔

عشرت ظفرؔ ادبی دنیا میں ایک معتبر نام ہے۔راہیؔ عمر میں ان سے بڑے اور سینئر تھے۔جب انہوں نے راہی صاحب کی شاعری پر مضمون لکھنے کے لئے کسی شعری مجموعے کی درخواست بذریعہ خط کی تھی جس کا جواب راہی صاحب نے ان جملوں میں دیا:''میں آپکی شخصیت اور شاعری سے بخوبی واقف ہوں۔جدید شاعری پر آپ کے گراں قدر مضامین کتابی شکل میں دیکھنے نیز استفادہ کرنے کا مجھے اشتیاق رہے گا۔میرے بھائی !اوّلین مجموعہ کلام ''لامکاں'' کی ایک جلد قسم کھانے کو بچی ہے۔یہ کتاب نصرت پبلی کیشنز لکھنؤ کی جانب سے شائع ہوئی تھی البتہ دوسرے مجموعے 'لاریب' کی فاضل جلدیں میرے پاس ہیں۔یہ دونوں کتابیں آپکو اقبال لائبریری اور کرائسٹ چرچ کالج کی لائبریری سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔'' [1]

عشرت ظفر نے راہیؔ کا جواب پا کر جو تاثر اخذ کیا وہ یہ ہے:

''جو کچھ انہوں نے میرے بارے میں لکھا ان کا میرے تئیں حسن ظن تھا لیکن جس انکساری اور محبت سے انہوں نے خط کا جواب دیا، کم و بیش تین تازہ اشعار نقل کر کے بھیجے۔اس نے ان کی محبت کا قائل کیا۔راہیؔ مجھ سے عمر میں بڑے تھے ان کا ادبی قد مجھ سے بڑا تھا۔وہ مجھ سے ہر طرح سے سینئر تھے۔یہ بھی ممکن تھا کہ وہ میری

---

[1] غلام مرتضیٰ راہیؔ کی شخصیت و فن کے نقوش از عشرت ظفر مطبوعہ سہ ماہی 'رنگ' شمارہ نمبر ۴۶

درخواست کونظر انداز کر دیتے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مجھے میرے خط کا جواب ملا''۔ ۱؎

پروفیسر عاصم شہنواز شبلی اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں کہ :'ایک بار الہٰ آباد سے فتح پور جانا ہوا تو ان سے روبرو ملاقات کرنے اور دوبدو گفتگو کرنے کا موقع ملا ان کی شخصیت کو سمجھنے سے رشید احمد صدیقی کے اس قول کی بھی تصدیق ہوگئی کہ ایک اچھا انسان ہی ایک اچھا شاعر ہوتا ہے'' ۔ ۲؎

غلام مرتضیٰ راہیؔ کی شاعری میں یہی سادگی اور اخلاص کی چاشنی جا بجا ملتی ہے۔ انسان دوستی، اخوت وآپسی خیر سگالی کا جذبہ ان کی فطرت کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی کارفرما ہے۔

مجھ کو ہو تیری فکر جہاں تک سفر رہے
تجھ کو مرا خیال جہاں تک غبار ہو
بوجھ سے جھکتی ہوئی شاخ کے غم کو لے کر
پھول بھی میری طبیعت پہ گراں بار ہوا
مجھ سے دیکھی نہیں جاتی ترے ماتھے پہ شکن
دوسرا رخ میری تصویر کا دیکھا مت کر

انسان اس عالم گیتی میں آنکھیں کھولتا ہے تو خود کو بے بس، لاچار اور دوسرے پر منحصر پاتا ہے۔ وہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے رونے کی صدائیں فضا میں گونجتی ہیں۔ اس کا رونا اس کی زندگی کی ضمانت ہوتا ہے۔ یہی رونا یعنی بے بسی عام زندگی کا حصہ بن کر رہ جاتی ہے۔ خوشیوں کا پل تو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کی طرح جسم سے مس ہو کر گذر جاتا ہے ساتھ تو رہ جاتی ہے وہ بے چاری بے بسی۔ یہی وجہ ہے قلی قطب شاہ سے لے

۱؎ غلام مرتضیٰ راہیؔ کی شخصیت وفن کے نقوش از عشرت ظفر مطبوعہ سہ ماہی 'رنگ' شمارہ نمبر ۲۶

۲؎ غلام مرتضیٰ راہیؔ اور جدید تر غزل از پروفیسر عاصم شہنواز شبلی مطبوعہ سہ ماہی 'رنگ' شمارہ نمبر ۲۶

کر اب تک جتنے شعراء وجود میں آئے انھوں نے اس کا اظہار اپنی شاعری میں ضرور کیا ہے۔ اسی بے بسی اور سوز و گداز نے میر تقی میرؔ کو ناخدائے سخن بنادیا۔ انھوں نے پوری زندگی غم کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور ادب میں وہ مقام حاصل کیا جو کسی دوسرے کو میسر نہیں۔ شعر ملاحظہ ہو۔

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

خواجہ میر دردؔ کو اس درد بھری شاعری نے اردو ادب میں اہم رتبہ عطا کیا۔

شمع کی مانند ہم اس بزم میں
چشم نم آئے تھے دامن تر چلے

غالبؔ کا مرثیۂ عارف آنکھوں کو نم کیے بنا نہیں رہتا۔

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

فانیؔ کا غم ان کی شاعری میں فلسفہ بن کر اجاگر ہوا جس سے ان کی غزلوں میں پائیداری آئی۔

غم کیا ہے اگر منزلِ جاناں ہے بہت دور
کیا خاکِ رہ یار ہوا بھی نہیں جاتا

غلام مرتضٰی راہیؔ اپنی شاعری میں غم کو بیجا طور پر پیدا کر قلب کو مردہ کرنے کی سعی نہیں کرتے بلکہ انھوں نے جو محسوس کیا جو مشاہدے کئے اسے من وعن اپنے اشعار میں پیش کردیا۔ حالات کی ستم ظریفی، بیگانگی، آنگنوں کے درمیان اٹھتی ہوئی

دیواروں، رشتے ناطوں کا پل میں ٹوٹ کر بکھرنے کا مشاہدہ راہیؔ نے بخوبی کیا ہے۔ان کے اشعار اس کے غماز ہیں۔

سبزے کی طرح میں نے بھی خود کو جھکا لیا
اب آندھیوں کو سر سے گذر جانا چاہیے

دھرتی کے نیچے کا پانی کھینچا ہوا
روٹھ گئی ہے اوپر سے برسات الگ

جس صبح کے خیال میں ہم سو نہیں رہے
اس کی کوئی کرن بھی شبِ تار میں نہیں

آتا تھا جس کو دیکھ کے تصویر کا خیال
اب تو وہ کیل بھی مری دیوار میں نہیں

شب کی خاموشی سے گھبراتا ہوں راہیؔ
آہٹیں سونے نہیں دیتیں سحر تک

آپ ہی آپ جھٹک دیتا ہوں دامن اپنا
اُف مرا خوف! نہ جگنو نہ شرارہ دیکھوں

مالک میرے بتلا ترا احسان رہے گا
اس گھر میں کہاں میں کہاں سامان رہے گا

کہیں دیوار کو کھولا کہیں در باز کیے
روشنی تب کہیں گھر آنے کو تیار ہوئی

راہیؔ پھر بھی مایوسیوں کے اندھیروں سے رہِ فرار اختیار نہیں کرتے بلکہ سماج کے لیے، پوری کائنات کے لئے روشنی تلاش کرنے میں جٹے ہیں۔زمانے کے بدلتے ہوئے حالات سے وہ بالکل مایوس نہیں بلکہ انھیں ایک نئی راہ نکلنے کی امید نظر آتی ہے۔

راہیؔ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو نئے رنگ و آہنگ سے سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں۔انھوں نے تخلیقی جولانی سے ہم آہنگ کر کے نئی امیجری تشکیل کی ہے۔ان کی شاعری اثبات و نفی پر مبنی ہے۔وہ زمانے کے رویوں سے جھلاتے نہیں۔مزاج میں کوئی بدلے کا جذبہ نہیں رکھتے بلکہ تبسم ریزیوں سے مسائل پر طنز کرتے ہیں۔وہ بجھی ہوئی خاک سے چنگاری تلاش کرنے کی امید کرتے ہیں۔اپنی سعئ پیہم پہ انھیں پورا بھروسہ ہے۔اس کا نتیجہ خواہ کچھ بھی برآمد ہو۔انھیں یقین کامل ہے کہ ان کی کشتی ساحل کو ضرور لگے گی۔طوفان کا کتنا ہی زوردار تھپیڑا اس کے وجود کی جڑ ہلانے میں سرگرداں کیوں نہ ہو۔

جھلکتی ہے میری آنکھوں میں بیداری سی کوئی
دبی ہے جیسے خاکستر میں چنگاری سی کوئی
کسی بھی موڑ سے میرا گذر مشکل نہیں ہے
میرے پیروں تلے رہتی ہے ہمواری سی کوئی
گہرائی سے دریا کی سروکار ہے مجھ کو
مٹھی میں مری کوئی گہر آئے نہ آئے
عین طوفان میں مقبول ہوئی میری دعا
ہر تھپیڑا مری کشتی کا مددگار ہوا

راہیؔ نے چھوٹی بحروں میں بھی اپنے عہد کے دبے کچلے انسانوں کی حقیقی زندگی کی محرومیوں کو قلمبند کیا ہے۔چھوٹی بحروں میں سمندر کو کوزے میں سمیٹنے کی ہنرمندی میرؔ، مومنؔ و غالبؔ کی شاعری سے ہی عود آئی ہے۔اس زمین سنگلاخ پر شاعری کا سبزہ اگانا مشکل ترین کام ہے۔اکثر شعراء کرام تنگ پگڈنڈیوں پر چلتے چلتے لڑکھڑانے لگتے ہیں اور معنی و مفہوم سے بے خبر ابہام و اہمال کی راہ پر نکل پڑتے ہیں۔ناصر کاظمی، حامدی کاشمیری، مظہر امام، مصور سبزداری، ساحل احمد، پرکاش فکری، صلاح الدین محمود اور عقیل

شاداب نے اس مشکل ترین شاہراہ سے گزر کر اپنی راہ ہموار کی اور دنیائے ادب میں اپنی منفرد پہچان بنائی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ غالبؔ، مومن کی ایک چھوٹی بحر کے شعر کی ندرتِ فکر سے اتنا متاثر ہوئے کہ وہ اس شعر کے بدلے اپنا دیوان ان کی نذر کرنے کو تیار ہو گئے۔ شعر یوں تھا۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

راہیؔ نے چھوٹی بحر میں نادر مضامین کے گل بوٹے کھلائے ہیں۔ انہوں نے اپنی فنکاری سے غزل کی اس تنگ دامانی کو ایسی وسعت بخشی کہ زندگی کے نشیب و فراز کے ہر پہلو اس میں با آسانی سما گئے۔

وہی تم سے کاٹے نہیں کٹ رہیں
جو راتیں ہیں میری گذاری ہوئی

ایک لاٹھی بہت سہارا تھی
کٹ گئے راستے مہیب مرے

بعض خوشیاں نہیں جینے دیتیں
بعض غم عمر بڑھا دیتے ہیں

دسترس کا اپنی اندازہ کرو
اپنے سائے کا کبھی پیچھا کرو

موت ہر وقت آنا چاہتی ہے
کوئی حیلہ کوئی بہانہ ہو

احساس کی لو گھٹا لی میں نے
میری ہی طرف لپک رہی تھی

سرحد کی لکیر دیکھ آئے
خنجر کی طرح چمک رہی تھی

آئینے کی طرح چمکتا تھا
پاؤں کے نیچے آ گیا پانی

آئینہ دکھلانے والا ایک دن
آئینے میں خود بھی شرمایا بہت

شاعری کا تعلق براہ راست دل سے ہوتا ہے۔شاعر الفاظ کی سحر انگیزی سے لطف اندوز ہوتا ہے اور کبھی کبھی تو اس کی ندرت سے اتنا متاثر ہوتا ہے کہ یہ الفاظ ذہن و دل کا حصہ بن کر رہ جاتے ہیں۔

کلیم الدین احمد نے اپنے ایک مضمون ''الفاظ اور شاعری'' میں الفاظ کے استعمال سے متعلق وضاحت اس طرح کی ہے:

''الفاظ جاندار ہوتے ہیں ہر لفظ کی ایک مخصوص فضا ہوتی ہے اور اس کا محسوس کرنا شاعر کے لئے ضروری ہے یہی نہیں بلکہ الفاظ کے عام استعمال اور شعری استعمال اور وجود میں نمایاں فرق ہو جاتا ہے۔حساس شاعر اپنے ذہنی معیار کے مطابق ان کا استعمال کرتے ہیں۔اگر کسی شعر میں الفاظ کا حسن ناقص ہو یا ان میں تغیر و تبدل کی گنجائش باقی رہے تو وہ شعر تمغۂ کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔بھرتی کے الفاظ کی موجودگی بھی شعر میں خلل انداز ہوتی ہے۔[1]''

مختلف شعراء نے مختلف الفاظ کا استعمال اپنی شاعری میں کثرت سے کیا ہے۔جمیل مظہری نے 'خودی' کو اپنے شعروں میں کافی جگہوں پر استعمال کیا ہے تو فراقؔ نے یاد اور ہجر سے اپنے اشعار کو تازگی بخشی۔وہیں بشیرؔ بدر کے یہاں شام ،لڑکی،

---

[1] الفاظ اور شاعری از کلیم الدین احمد

چاند، چاندنی، آنسو جیسے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔

سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے
نیند آگئی ہے آج ستاروں کو شام سے

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

چاند نے رات مجھ کو جگا کر کہا
ایک لڑکی تمہارا پتہ لے گئی

ساحل پہ شام کتنی گمبھیر ہے کہ دریا
رک رک کے بہہ رہا ہے آواز میں تھکن ہے

علقمہ شبلی کے یہاں 'خواب' لفظ کی بھرمار ہے۔

عمر بھر دھوپ میں یوں ہی تڑپو
تم نے کیوں خواب سحر کا دیکھا

اسی طرح غلام مرتضیٰ راہی کی شاعری میں مخصوص لفظیات کا مسلسل استعمال لسانی ذائقے فراہم کرتا ہے۔ جن میں دیوار، دریا، آئینہ اور پتھر اہم ہیں۔ ایک سو سولہ غزلوں پر مشتمل مجموعہ 'لاکلام' میں دریا لفظ اکیاون، آئینہ سے تئیس اور پتھر لفظ سے پچیس اشعار ہیں۔ اڑسٹھ غزلوں پر مشتمل مجموعہ 'حرفِ مکرر' میں لفظ دریا سے بائیس، آئینہ سے بیس، دیوار سے آٹھ اور پتھر سے سترہ اشعار ہیں جبکہ سڑسٹھ غزلوں پر مشتمل مجموعہ 'لاریب' میں لفظ دریا سے چھ، آئینہ سے چھ، دیوار سے چودہ اور پتھر سے اٹھارہ اشعار ہیں۔ ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط نے اپنے مضمون (دیوار۔ غلام مرتضیٰ راہی کے کلام میں) میں کچھ اس طرح وضاحت کی ہے۔

''غلام مرتضیٰ راہی نے لفظ 'دیوار' کو سو طرح سے باندھا ہے اور اس انداز

سے کہ اس پامال لفظ سے شعری حسن نکھر آیا ہے اور لفظ کی معنوی خوبی دو چند ہوئی ہے۔ جدیدیت کی شعری روایت نے قدامت کی دیواروں میں روزن و در یچے ہی نہیں باب و در وا کئے ہیں جن سے داخل ہونے والے الفاظ حسن صوری میں نہیں، حسن معنوی میں جدت لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ شعراء جو الفاظ کی تہہ داری اور اس کی معنوی آبداری کو پرکھے ہوئے ہیں ان کے یہاں اشعار میں الفاظ کی پچی کاری پیوند نہیں حسن بن کر نکھرتی ہے۔ غلام مرتضٰی راہی ایسے ہی الفاظ کے شناسا شاعر ہیں۔ ان کے شعری گلستان میں لفظ کا ایک پھول صد ہا رنگوں میں اپنی رنگینی دکھاتا ہے''۔ [1]

غلام مرتضٰی راہی نے اپنی غزلوں میں پتھر، دیوار، آئینہ اور دریا کو موضوعِ شعر بنانے میں نہ صرف معاصرین بلکہ مقلدین کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اکثر و بیشتر ہوتا ہے کہ جب کوئی بڑا شاعر کسی ایک لفظ کو تخلیقی شان کے ساتھ پیش کرتا ہے تو اس رنگ میں شعر کہنے کی ہوڑ مچ جاتی ہے۔ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔۔۔۔۔۔ یعنی فیشن زدہ اور جگالی کئے ہوئے الفاظ اگر دست بستہ غلام مرتضٰی راہی کے سامنے کھڑے ہوں تو نئے پیکر تراشی کے دروازے کب تک بند رہ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر پتھر، دیوار، آئینہ، دریا کے حوالے سے درج ذیل اشعار Quote کئے جانے کے بعد دل و ذہن پر دیرپا تاثر قائم کرتے ہیں۔

دیوار

ہاتھوں میں یہ پتھر جو لئے ہو انھیں چن لو
سایہ بھی فزوں ہوگا جو دیوار بڑھے گی

کیوں میری آڑ لے کے کوئی بیٹھنے لگا
بنیاد کوئی ریت کی دیوار میں نہیں

آتا تھا جس کو دیکھ کے تصویر کا خیال
اب تو وہ کیل بھی مری دیوار میں نہیں

پھینکنے والوں نے پہچان نہ جانی ان کی
جڑ گئے ہیں مری دیوار میں پتھر کیا کیا

---

[1] دیوار۔غلام مرتضٰی راہی کے کلام میں، از ڈاکٹر یحییٰ نشیط

کھڑی ہوئی ہے بڑے صبر سے مری دیوار — غمِ شکستگیٔ بام و در اٹھائے ہوئے
جو ہم نے رخنۂ دیوار چھوڑ رکھا تھا — نظر اسی سے وہ صورت کبھی کبھی آئی
پہلے دیوار میں چنوا دیا مالک نے مجھے — پھر عمارت کو مرے نام سے موسوم کیا
یاروں نے میری راہ میں دیوار کھینچ کر — مشہور کر دیا کہ مجھے سایہ چاہیے
چڑھتے سورج کی طرف کوئی نہیں دیکھ رہا — سب سمجھتے ہیں کہ دیوار میں سایہ ہی نہیں

دریا

اتنے فریب کھائے ہیں میں نے کہ اب مجھے — دریا کہیں ملا تو لگے گا سراب سا
اے مرے پایاب دریا! تجھ کو لے کیا کروں — ناخدا، پتوار، کشتی، بادباں رکھتے ہوئے
مل کے آپس میں پی گئے ہوں گے — دو کناروں میں ایک دریا تھا
چاہتا ہے وہ کہ دریا سوکھ جائے — ریت کا بیوپار کرنا چاہتا ہے
ساحل پہ رہ کے تیرنا آیا نہیں جنھیں — دریا میں ان کو ڈوب کے مر جانا چاہیے

آئینہ

آئینے کی طرح چمکتا تھا — پاؤں کے نیچے آ گیا پانی
آئینہ دکھلانے والا ایک دن — آئینے میں خود شرمایا بہت
رہے گا آئینے کی طرح آب پر قائم — ندی میں ڈوبنے والا نہیں کنارہ مرا
رکھ دیا وقت نے آئینہ بنا کر مجھ کو — رُوبہ رُو ہوتے ہوئے بھی میں فراموش رہا
میں ترے واسطے آئینہ تھا — اپنی صورت کو ترس، اب کیا ہے

پتھر

کب تک انھیں اچھالا گیا کچھ پتہ نہیں — کب سے پہاڑ بن گئے پتھر کہا نہ جائے
پتہ نہیں کہ وہ پتھر تھا، پھول تھا، کیا تھا — جدھر سے آیا تھا میں نے اُدھر اچھال دیا
بھنک کسی نہ کسی طرح پا گئے پتھر — شجر میں پھل کوئی آیا کہ آ گئے پتھر

چھپا تھا ہیرا کوئی راستے کے پتھر میں　　ہماری ٹھوکروں نے اس کا انکشاف کیا
رہ گیا تشنۂ تعمیر، صنم خانہ مرا　　کبھی آزر، کبھی تیشہ، کبھی پتھر نہ ملا

انسان جب گردشِ ایام سے گھبرا جاتا ہے چہار سمت ظلمت کے بادل گھر آتے ہیں اور اُن کے چھٹنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی تو دل دماغ اس مالکِ حقیقی کی طرف راغب ہونے لگتے ہیں۔ انسان اسی ذاتِ واحد سے اپنی شکایت اور پریشان کن حالات کا دکھڑا سنانے لگتا ہے کیونکہ وہی عزت اور ذلت بخشنے والا ہے۔ وہی سب پر قادر ہے۔ علامہ اقبال کے بہت سے اشعار اس شوخی و ظرافت سے پُر ہیں۔

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے
پر ترے نام پہ تلوار اٹھائی کس نے
بات جو بگڑی ہوئی تھی وہ بنائی کس نے
باغِ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

غالبؔ کے کئی اشعار اسی قبیل کے ہیں۔

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

غالبؔ جیسے گہری فکر و نظر کے شاعر کا خدا سے چھیڑ چھاڑ کے بعد بہت کم شاعروں نے اس طرح کی گلفشانی کی ہے۔ اقبالؔ کے بعد تو یہ سلسلۂ کلام تقریباً منقطع ہی ہے لیکن غلام مرتضیٰ راہیؔ نے اپنی ظرافتِ طبعی سے یہ کارنامہ بھی انجام دیدیا۔ ان

کے کئی شعروں میں خدا سے شوخیٔ کلام کی جھلک ملتی ہے۔ انھوں نے خدا کے مرتبے کو ملحوظ رکھتے ہوئے بڑے مؤدبانہ انداز میں اپنی بات کہنے کی جرأت کی ہے۔

ہوگیا میری گدائی سے ترا در خالی
ایسے بھرنے سے تو کشکول تھا بہتر خالی

کیوں اس کو اپنا مالک و مختار کہتا ہوں
اپنے کو میں سمجھتا ہوں مجبور کس لیے

کرتا نہیں ہے کیوں وہ حقیقت مری بیاں
اوروں کے قصے کردیے مشہور کس لیے

غلام مرتضیٰ راہیؔ کے ہم عصر اور رجحان ساز شخصیتوں میں بشیر بدر، باؔنی، مظفر حنفی، مصوّر سبزواری، عرفان صدیقی، مظہر امامؔ اور پرکاش فکریؔ کے نام اہم ہیں۔ غلام مرتضیٰ راہیؔ اور بشیر بدر ایک ہی شہر میں بود و باش اختیار کرنے کی وجہ سے ایک دوسرے سے خاصے متاثر رہے ہیں لیکن کمال کی بات یہ ہے کہ بشیؔر بدر کا کوئی بھی رنگ انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اکثر و بیشتر دیکھا گیا ہے کہ دو اہم معاصرین جب شعر کہتے ہیں تو غزل میں اپنی انفرادیت بہ مشکل قائم کر پاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اندر کی Fertility شعری جہت سے ہم آہنگ ہو کر طبیعت میں مخصوص قسم کی رمزیت پیدا کرتی ہے۔ غلام مرتضیٰ راہیؔ نے اس وصف کو اپنے کلام میں ہمیشہ برقرار رکھا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ خود ساختہ شاعر اعظم کہے جانے والے بشیر بدؔر کی انھوں نے نہ صرف پر جواز کاٹ پیش کی بلکہ ہر شعر میں اپنی موجودگی کا بھی احساس دلایا۔ بشیؔر بدر نے کیا خوب کہا ہے۔

کیوں چاندنی راتوں میں دریا میں نہاتے ہو
سوئے ہوئے پانی میں کیوں آگ لگاتے ہو

اس شعر میں سوئے ہوئے پانی جیسے استعارے کو الگ کر دیا جائے تو شعریت کا نام ونشان مٹ جاتا ہے لیکن غلام مرتضیٰ راؔہی کے یہاں پانی کے حوالے سے ششدر کی کیفیت ایسی ہے کہ گھنٹوں اس سے حظ اٹھایا جاسکتا ہے۔

آئینے کی طرح چمکتا تھا
پاؤں کے نیچے آگیا پانی

بشیر بدؔر کی شاعری میں لفظیات کی جادوگری ہے۔ بالکل سہل اور سادہ الفاظ میں تخیل کا اظہار ان کا ہی حصہ ہے۔ وہ اپنے طرز کے امام اور مقتدی دونوں ہیں۔ بشیر بدؔر کے یہاں الفاظ ہی الفاظ ہیں اور تکمیلیت کا فقدان ہے۔ لفظی شعبدہ گری سے بات نہیں بنتی بلکہ سوچ کی گہرائی دگیرائی ایک اچھی شاعری کی بہترین مثال ہے۔ غلام مرتضیٰ راؔہی کی شاعری میں زندگی ہے اسی احساسِ زندگی نے مردہ دلوں میں زندہ رہنے کی قوت عطا کر رکھی ہے۔

باؔنی نے اپنی حیات میں ہی جن شعرا کے درخشاں مستقبل کا اشاریہ پیش کیا تھا ان میں غلام مرتضیٰ راہی بھی ہیں۔ باؔنی انھیں غیر معمولی شاعر قرار دے چکے ہیں۔ اس کی فطری وجہ یہ رہی ہے کہ راہی کے یہاں شروع سے ہی ایک انوکھا تجسّس دیکھنے کو ملتا ہے۔ بعض اشعار میں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ باؔنی سے آگے نکل گئے ہیں۔

میں ترے واسطے آئینہ تھا
اپنی صورت کو ترس ، اب کیا ہے
کسی محفل کسی تنہائی میں رکنا ہے مشکل
مجھے کھینچے لیے جاتی ہے بیزاری سی کوئی

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اندازِ پیشکش کے اعتبار سے غلام مرتضیٰ راؔہی، مصور سبزواری کے لہجے سے قریب رہے ہیں لیکن یہ محض وہم ہے۔ مصور سبزواری کی

لفظیات ان کی شناخت کے لیے کافی ہیں لیکن اس کے برعکس غلام مرتضٰی راہی خیال کے اعتبار سے زیادہ واضح ہیں ۔ مضمون کی کاٹ کا شعوری استعمال دونوں کو منفرد بناتا ہے لیکن راہی اس معاملے میں معروضی اندازِ نظر اختیار کرتے ہیں۔

اک سنگ نامراد کا ہوتا ہے اس پہ شک
دریاؤں کو بھی پی کے وہ بادل نہیں رہا
(مصورؔ سبزواری)

مل کے آپس میں پی گئے ہوں گے
دو کناروں میں ایک دریا تھا
(غلام مرتضٰی راہی)

بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ غلام مرتضٰی راہی کی شاعری میں زبردست حیرت نا کی ہے۔ قاری ان کے اشعار پر چونکے بغیر نہیں رہتا۔ راہی کے اندر وہ حیرت انگیز صلاحیت ہے جس سے وہ اپنے مخصوص مواد میں تغیر لاتے ہیں۔ ان کے معاصرین نے ہمواری اور ناہمواری کا ذکر اپنی شاعری میں کیا ہے لیکن ان دونوں کے بیچ بھی کوئی شئے ہے جس پر صرف اور صرف غلام مرتضٰی راہی کی عقابی نظر پڑتی ہے جس کا اظہار ان کے اشعار میں بخوبی ملتا ہے اور یہی ان کی شاعری کا نشانِ امتیاز ہے۔

ہر شام کناروں کو لگا رہتا ہے دھڑکا
مچھوارا سمندر میں نظر آئے نہ آئے

اٹھنے سے بلبلوں کے گزرتا ہے یہ گماں
لیتا ہو سانس جیسے کوئی زیرِ آب سا

لے گئی پار بٹھا کر مجھے ایک ٹکڑے پر
میں نے ٹوٹی ہوئی کشتی پہ بھروسہ رکھا

عین طوفان میں مقبول ہوئی میری دعا
ہر تھپیڑا مری کشتی کا مدد گار ہوا

****

باب نمبر۲۔

مختصر سوانحی خاکہ

غلام مرتضیٰ راہیؔ

غلام مرتضیٰ راہیؔ کے سوانحی خاکے میں رنگ بھرنے سے قبل اس نکتے کو ذہن میں رکھنا بے حد ضروری ہوگا کہ ان کی جبیں پر جو لہو روشن ہے وہ ان کے آباواجداد کی دین ہے۔ انہیں بقولِ غالبؔ ''سو پُشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری'' پر نہ ناز ہے اور نہ درونِ ذات کی شخصیتِ شاعرانہ پر فخر۔ شاعری کو ذریعۂ عزّت سمجھنے کا بھرم بھی یہ نہیں پالتے ہیں۔ سرمایۂ شعر کیلئے رواں لہو کا تصرّف جائز قرار دینے کا ہی نتیجہ ہے کہ انکی شعری شخصیت کو سمجھنے سے قبل ہی گذرے واقعات وسانحات ان کے ہنر کے اجزائے ترکیبی بن کر سامنے آتے ہیں۔

غلام مرتضیٰ راہیؔ کے مورثِ اعلیٰ احمد خاں بہادر کے صاحبزادے محمود خاںؔ (حولدار رسالہ) شہنشاہ اورنگ زیب کے حکم سے ۱۶۵۹ء میں دہلی سے ہجرت کر کوڑا جہان آباد اور کھجوا ہوتے ہوئے ضلع فتح پور (یو پی) کے موضع کنور پور میں اقامت گزیں ہوئے تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ۱۶۵۹ء میں کھجوا میں شہنشاہ اورنگ زیب نے اپنے بھائی شجاع پر فتح حاصل کی تھی۔ شجاع بنگال اور آسام ہوتے ہوئے اراکان پہنچا۔ جہاں اسے قبائلیوں کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا۔ ۱۶۵۹ء کی اس جنگ میں اورنگ زیب کی طرفداری میں محمود خاں بھی شریک تھے۔ کنور پور ایک تاریخی مقام ہے جو کھجوا اور فتح پور کے درمیان مغل روڈ پر واقع ہے یہاں جگہ جگہ مقبروں، مسجدوں، مندروں اور امام باڑوں

کے آثار دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے معرکہ میں جو انگریز سپاہی مارے گئے تھے ان کا قبرستان کنور پور میں واقع ہے اور گوروں کے قبرستان کے نام سے منسوب ہے۔

غلام مرتضیٰ راہی کے پردادا میکن خاں غوری کنور پور کے بڑے دلیر اور جاں باز شخص تھے ۳۰/اپریل ۱۹۰۴ء میں دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ وہ لاٹھی کی نمائش بنوٹ کے ماہر تھے کہتے ہیں کہ جب وہ بنیٹھی گھماتے تو ان کا جسم دیکھائی نہیں دیتا تھا۔ بدن میں غضب کی پھرتی تھی۔ میکن خاں کی زوجہ خیرالنساء بیگم بنت مدار بخش نے ۹۹ وے برس کی عمر میں کنور پور میں وفات پائی تھی۔ تقریباً دوسو برس سے میکن خاں غوری کے مکان سے محرّم الحرام کی آٹھویں تاریخ کو ''پلنگ'' بڑے تزک و احتشام کے ساتھ اٹھتا آرہا ہے۔ یہ آٹھویں پورے ضلع میں مشہور ہے جس میں دور ونزدیک کے عقیدت مند حضرات بڑی تعداد میں شریک ہوتے ہیں میکن خاں غوری کے صاحبزادے محمّد رمضان خاں غوری کی پیدائش ۳۰ دسمبر ۱۸۷۸ء میں ہوئی تھی جو اُتر پردیش کے محکمۂ آب پاشی سے بحثیت امین وظیفہ یاب ہونے کے بعد کنور پور کی قدیم سرائے میں واقع مُغلیہ زمانے کی مسجد میں امامت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ علاقے میں ان کی خوش گلوئی کی دھوم تھی وہ خواجہ غریب نواز حضرت معین الدین چشتیؒ سے کافی عقیدت رکھتے تھے۔ صوفیانہ کلام اور قوالیوں کے شوقین تھے۔ اکثر یہ شعر گنگناتے پھرتے تھے جو اجمیر شریف میں کسی قوال سے سنا تھا۔

مدینے جا کے رسولِ خدا سے کہدوں گا
کہ مجھ غریب کی سنتے نہیں غریب نواز

رمضان خاں کے پاس لکڑی کا ایک بڑا سا صندوق تھا جس میں وہ دینی کتب و رسائل اور ٹِن کا ایک چونگا رکھا کرتے تھے۔ چونگا کے اندر زرد آلود کاغذ کی چکنی اور کشادہ سیٹ پر ان کے اسلاف کا شجرہ ٔحسب نسب نقش تھا۔ اسی نقش سے پتہ چلتا ہے کہ غلام

مرتضٰی راہی غوری خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔لکڑی کا یہ صندوق کنور پور کے کچّے مکان میں رکھا ہوا تھا جو ۱۹۷۱ء کی بارش میں چھتوں اور دیواروں کے بیٹھ جانے سے اس کے اندر دب گیا تھا۔بعد میں دیمکوں نے اسکا قصہّ تمام کر دیا۔غلام مرتضٰی راہی کے والد غلام مصطفٰے خاں غوری کا نکاح دسمبر ۱۹۳۰ء میں عبدالوحید خاں ساکن محلّہ چودھرانہ فتح پور کی خیر النساء سے ہوا۔غلام مرتضٰی راہی ان ہی کے بطن سے ۲۳/مارچ ۱۹۳۷ء کو اپنے نانا عبدالوحید خاں کے مکان میں بعد دو پہر عالمِ وجود میں آئے۔غلام مرتضٰی راہی کے والد محترم اپنے بچوّں کی مستقل رہائش اور تعلیم کی غرض سے شہر فتح پور کے محلّہ پنی میں مکان بنوا کر سکونت پذیر ہو گئے تھے۔وہ محکمۂ آب پاشی میں امین کی حیثیت سے ملازم تھے انہیں موسیقی سے کافی لگاؤ تھا۔ہارمونیم بڑے شوق سے بجاتے تھے لیکن ان کے دو جوان بیٹے مختار احمد خاں ۱۹۵۳ء میں اور سردار احمد خاں ۱۹۵۷ء میں حادثے کا شکار ہو گئے تب سے انہوں نے ہارمونیم کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا انہیں شعر و شاعری اور مطالعے سے گہری دلچسپی تھی۔محکمۂ آب پاشی کی میگزین ''انجمن النہار'' میں ان کا کلام اکثر شائع ہوتا رہتا تھا۔

غلام مرتضٰی راہی کا خاندانی شجرہ اس خاکے سے واضح ہے۔

احمد خاں بہادر
↓
محمود خاں (حولدار رسالہ)
↓
میکن خاں غوری (پردادا)
↓
محمد رمضان خاں غوری (دادا)

حسین احمد خاں غوری (چچا) — غلام مصطفٰے خاں غوری (والد)

غلام مصطفٰے خاں غوری (والد) کی اولاد:

سرفراز احمد خاں — اعجاز احمد خاں — سکندر جہاں (مرحومہ) — سردار احمد خاں (مرحوم) — غلام مرتضٰی راہی — مختار احمد خاں (مرحوم)

شہر فتح پور کانپور اور الہٰ آباد کے وسط میں آباد ہے جو آج بھی شہر کم دیہات زیادہ معلوم پڑتا ہے لیکن تاریخی اعتبار سے اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ڈاکٹر اوم پرکاش اوستھی صدر شعبۂ ہندی مہاتما گاندھی پوسٹ گریجویٹ کالج، فتح پور نے اپنی تحقیقی کتاب 'انواک' میں فتح پور کی تاریخی، تہذیبی، تمدنی اور ادبی حیثیت کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ فتح پور کو قومی یکجہتی، خیر سگالی اور امن و امان کا شہر مانا جاتا ہے۔ یہاں کبھی کوئی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا۔ یہاں کے لوگ نہایت شریف، نیک اور اخلاق مند ہیں۔ان کے آپسی تعلق کے بیچ مذہب کبھی دیوار نہیں بنا۔ دورانِ تقسیم ہند یہ شہر امن و امان کی ایک مثال بن کر دوسرے شہروں کو منہ 'چڑا' رہا تھا۔ علامہ نیاز فتحپوری، ڈاکٹر فرمان فتحپوری، مجاہد حسین حسینی، مظفر حنفی، اور ڈاکٹر ابو محمد سحرؔ جیسی قد آور شخصیتیں فتح پور سے وابستہ رہی ہیں جن کی شہرت عالمگیر سطح پر جانی اور مانی جاتی ہے۔اسی شہر کی 'راہی منزل' میں بود و باش اختیار کرنے والے شاعر غلام مرتضیٰ راہیؔ اپنی فکری دبازت اور جدید لب و لہجے کے لئے پوری شعری کائنات میں معروف ہیں۔ ذہن کھلا ہوا، دل کدورت سے پاک، چہرہ کھلی کتاب، آنکھیں اندر سے باہر تک دیکھنے والی، پیشانی سامنے سے کھلی ہوئی، لب بولتے ہوئے، ناک کسی معطّر شئے پر ٹکی ہوئی، خوش سماعت، بال کالے اور گھنے، جسم توانا، بدن میں غضب کی سرعت یہ سبھی غلام مرتضیٰ راہیؔ کے اوصاف ہیں۔ غلام مرتضیٰ راہیؔ بزرگوں کا بے حد احترام کرتے ہیں۔شاہ منظور عالم مثنوی مولانا رومؔ کے مفسّر اور خانقاہ موجِ شاہی کے صوفی و بزرگ ہیں۔انہوں نے غلام مرتضیٰ راہی کے بارے میں لکھا ہے کہ ''یہ تصوف کے مرد میدان ہیں اور ان کے خاندان میں ان کے دادا کے زمانے تک فقیری رہی ہے۔ یہ اُسی چشمے کے پانی سے سینچے ہوئے شجر ہیں۔راہیؔ ایک بار خانقاہ تشریف لائے ہوئے تھے۔ کچھ دیر اسی مٹھاس بھرے لہجے میں باتیں کرتے رہے کہ ایک صاحب تشریف لائے جنہیں میں روز اسی جگہ بٹھا کر

تکریم دیتا ہوں جہاں یہ تشریف فرما تھے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت ادھر تشریف لے آئیں۔ راہیؔ صاحب ذرا چونکے لیکن اشراف کی تہذیب کا نمونہ دیکھئے کہ خندہ پیشانی کے ساتھ اٹھے اور بلا کسی کراہت اور ناگواری کے دوسری جگہ پوری دل جمعی کے ساتھ بیٹھ گئے۔ آج کے زمانے کا کوئی مائی کا لال ہوتا تو بے کیف ہو جاتا۔ بیہودگی کرتا ہوا بد دماغ بن کر ذرا دیر میں چلا جاتا نہ کہ یہ اسی طرح مزے سے باتیں کرتے رہے جیسے کہ کر رہے تھے بلکہ ہوا یوں کہ یہ تپاک سے مخاطب ہو کر اسی طرح اُٹھ گئے جس طرح محبت بھرے لہجے میں رخصت ہوتے تھے۔ یہی وہ اچھے انسان کی پہچان ہے کہ جو مجبور کرتی ہے انہیں ایک فرشتہ صفت انسان سمجھا جائے۔''[1]

پروفیسر عاصم شہنواز شبلی اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں کہ ''ایک بار الہٰ آباد سے فتحپور جانا ہوا تو ان سے روبرو ملاقات کرنے اور دوبدو گفتگو کرنے کا موقع ملا تو رشید احمد صدیقی کے اس قول کی تصدیق ہوگئی کہ ایک اچھا انسان ہی ایک اچھا شاعر ہوتا ہے۔''[2] جناب رونق شہری اور راقم الحروف جب غلام مرتضیٰ راہیؔ سے ملنے فتحپور پہنچے تو موصوف ظفر اقبال ظفؔر اور قمؔر صدیقی کے ہمراہ فتحپور اسٹیشن پر بے صبری سے ہم دونوں کا انتظار کر رہے تھے۔ بڑے ہی گرم جوشی سے استقبال کیا اور باہر Scarpio میں بٹھا کر اپنے گھر پہنچا لے آئے۔ دو روز کے قیام میں انہوں نے جو خاطر داری اور حسن سلوک روا رکھا ہم آج تک اس کے قائل ہیں۔ ہم دونوں کے اعزاز میں شعری نشست کا انعقاد کیا گیا۔ کافی پذیرائی کی گئی۔ دوسرے دن نورالہدیٰ ہائی سینیئر سکنڈری اسکول و دیگر تاریخی مقامات کی سیر کرائی گئی۔ طعام و قیام کا عمدہ انتظام کیا گیا۔ شہر کی معزز ہستیوں سے ہماری ملاقاتیں کرائی گئیں غرضیکہ انہوں نے ہماری خاطر داری میں

---

1. غلام مرتضیٰ راہیؔ۔ میری نظر میں۔ صوفی شاہ منظور عالم، مطبوعہ اسباق، پونہ۔ جنوری تا دسمبر ۲۰۰۶ء
2. غلام مرتضیٰ راہی اور جدید غزل۔ پروفیسر عاصم شہنواز شبلی، مطبوعہ سہ ماہی 'رنگ' دھنباد اپریل تا جون ۲۰۰۴ء

کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔

غلام مرتضٰی راہی بے حد حسّاس طبیعت کے مالک ہیں۔انکی یہ فطرت ان میں اوائل عمری سے ہی موجود ہے۔ ہر وقت کسی نہ کسی خیال میں گم رہنے کی عادت نے انہیں تنہائی پسند بنا دیا تھا۔ ہمیشہ کائنات کے تخلیقی مواد پر ان کا ذہن کافی دیر تک سوچتا اور تجزیہ کرتا رہتا۔خود تردیدی اور خود تنسیخ کے عمل سے ان کے اندر مضمر جواہرات عیاں ہونے لگے۔ یہ عمل ان کی شاعری میں بھی جا بجا دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کے حسّاس ہونے کا یہ عالم ہے کہ کسی جاندار کو ذبح ہوتے دیکھ لیا تو اس کا گوشت منہ پر نہیں لگاتے بلکہ وہ شئے یا جاندار جو خوشنما اور بھلے نہیں ہوتے وہ اپنے لقمے کا حصّہ نہیں بناتے۔اگر ان کے کھانے کے برتن میں مکھی یا کیڑا پڑ جائے تو پھر وہ خالی پیٹ دستر خوان سے اُٹھ جانے پہ اکتفا کرتے ہیں۔راہی مزاجاً بڑے نفیس اور خوش طبع انسان ہیں۔خوش لباسی، خوش گفتاری، خوش اخلاقی ان کی پہچان ہے۔دو روزہ فتح پور کے قیام میں میں ان کے خوش اطوار ہونے کے ساتھ ساتھ خوش لباسی سے بھی متاثر ہوا۔خوش اخلاقی ایسی کہ پہلی ہی ملاقات میں آدمی ان کا پُرستار ہو جائے۔لوگ انکی گفتگو کی کشش سے اسطرح بندھ جاتے ہیں کہ وقت کے گذر جانے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔

غلام مرتضٰی راہی کا بچپن دیہی ماحول میں گذرا۔اپنے والد محترم غلام مصطفٰے خاں کے ہمراہ کھیتوں کی سیر کیا کرتے تھے۔کھیتوں کے لہلہاتے پودے اور ان میں بالیوں کے جھومر دل کو کچوکے لگا جاتے تھے۔ وہ گھنٹوں ندیوں اور تالابوں کی اچھلتی ہوئی لہروں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ پہاڑوں سے ہو بہو لوٹتی ہوئی صدائیں انکے تجسس کو کریدتی تھیں۔وہ گھنٹوں پرندوں کی میٹھی بولیوں کی کشش میں گرفتار رہتے۔کوئل کی کوک اور مور کے رقص سے ابھرتی ہوئی پازیبی جھنکار ان کے ذہن کی پاکیزگی کو ظاہر کرتی تھیں۔ پڑوس کے جانوروں کے حرکات وسکنات پر گہری نظر رکھنا، اوس سے بھیگی

ہوئی سرسبز منڈیروں کے اوپر ننگے پاؤں چلنا۔ چلتے چلتے کسی پودے کی پتی کو نوچ لینا، پھول توڑ لینا، ندی، نہروں اور تالابوں میں تیرنا یہ سبھی غلام مرتضیٰ راہیؔ کے بچپن کے پسندیدہ اشغال تھے۔ فصلوں کی سینچائی کے لئے رہنٹ کا گھومنا، اس سے کنویں کی تہہ سے بالائی سطح تک پانیوں کا پہنچنا اور پھر اس کا متعین جگہ پر انڈیل دینا۔ اسی عمل کو بار بار دہراتے رہنا راہیؔ کے لئے دلچسپ اور پُر اسرار تھے۔ بعد میں یہی فطرت کے جذبات اور ان سے والہانہ تعلق کا اظہار انہوں نے اپنی شاعری میں کیا ہے۔ انہوں نے اپنی خودنوشت ''منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی'' میں اس امر کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے۔ ''کھیت کھلیان، باغ باغیچے، نہر، ندی، تالاب، پہاڑ، جنگل، چرندے، پرندے، درندے سب کے سب میری شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں متحرک رہے۔ فطرت سے میرے جذباتی اور والہانہ تعلق کا شعری اظہار میرے یہاں جا بجا ملتا ہے۔ گرد وپیش سے شعر اخذ کرنے کی میری غیر معمولی قوت متخیلہ مجھے نیچر ہی سے ودیعت ہوئی ہے''۔ [1]

غلام مرتضیٰ راہیؔ کو کھیل کود سے خاصی دلچسپی تھی۔ پتنگ بازی، گلی ڈنڈا، بھاگ دوڑ، کبڈی، تیراکی، کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، بیڈمنٹن، والی وال وغیرہ شوق سے کھیلا کرتے تھے۔ ان کے کھیل کود میں اس ماحولیات کا زبردست ہاتھ ہے۔ جہاں انکی پرورش و پرداخت ہوئی۔ ماضی قریب میں شطرنج، کیرم اور تاش کی ایک قسم 'برج' سے ان کا گہرا شغف رہا ہے۔ ان تفریحی مشاغل نے کبھی ان کی تعلیم کو متاثر نہیں کیا۔ وہ اپنی پڑھائی کے لئے وقت نکال لیا کرتے تھے۔ غلام مرتضیٰ راہیؔ بلا کے ذہین واقع ہوئے ہیں۔ ان کے پردہ چشم میں ڈھائی تین برس کی عمر میں رونما ہونے والے واقعات آج بھی عکس بن کر ابھر آتے ہیں۔ انہیں آزادی کی پہلی صبح کا وہ منظر یاد ہے جب وہ اپنے والد کے ہمراہ انکی سائیکل پر سوار ہو کر پولس پریڈ گراؤنڈ گئے تھے۔ وہاں وقت معینہ پر

---

[1] منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی۔ غلام مرتضیٰ راہیؔ، مطبوعہ سہ ماہی 'رنگ' دھنباد

برطانیہ کا پرچم اتار کر ہندوستانی ترنگا جھنڈا الہرایا گیا تھا جو فضا میں بڑی آن بان شان سے لہرا رہا تھا اور لوگ انہیں فخریہ انداز سے دیکھ رہے تھے۔ امن کی علامت سمجھے جانے والے کبوتروں اور رنگ برنگ غباروں کو فضا میں اڑا دئے گئے تھے۔ یہ منظر راہیؔ کے لئے تحّیر آمیز اور مسرت بھرا تھا۔ راہیؔ ہم جماعتوں کو درس دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ انہوں نے ۱۹۵۳ء میں گورنمنٹ انٹر کالج سے ہائی اسکول پاس کیا۔ مولانا حسرت موہانی نے بھی یہیں سے ۱۸۹۸ء میں میٹرک پاس کیا تھا۔ راہیؔ کو مسلم انٹر کالج فتحپور کے انٹر میڈیٹ کے اولین بیچ کے طالب علم ہونے کا فخر حاصل ہے۔ مدرسہ اسلامیہ و مسلم ہائی اسکول کے بانی مولانا سید ظہور الاسلام تھے۔ یہاں علامہ نیاز فتحپوری اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری جیسی عظیم شخصیتوں نے درس و تدریس کے کام انجام دئے ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں انہوں نے انٹر میڈیٹ کا امتحان پاس کیا اور کانپور کے کرائسٹ چرچ کالج میں بی۔ اے۔ میں داخلہ لیا۔ کرائسٹ چرچ کالج اپنے معیارِ تعلیم اور نظم وضبط کے لئے پورے اتر پردیش میں مشہور تھا۔ کانپور اور اطراف کے معزز خاندان کے افراد اس کالج میں داخلہ لینا اپنی شان سمجھتے تھے۔ بی۔ اے۔ کے سال اوّل کے امتحان کے دوران ان کی صحت خراب ہوگئی تھی۔ حرارت اور نقاہت نے ان پر ایسا اثر کیا کہ مجبوراً ایک برس کیلئے تعلیمی سلسلہ کو موقوف کرنا پڑا۔ صحت بحال ہونے پر مزید تعلیم جاری رکھی۔ B.A. کا نتیجہ آنے سے قبل خان غفران زاہدی کی سفارش سے روزنامہ ''سیاست جدید'' میں انہیں معاون مدیر کی حیثیت سے بحال کرلیا گیا تھا۔ خان غفران زاہدی اس وقت سیاست جدید کے مدیر تھے اور غلام مرتضیٰ راہیؔ کی طرح وہ بھی کانپور کے محلّہ 'بزریا' میں مولوی یعقوب کے مکان میں کرایہ دار تھے۔ اُن سے غلام مرتضیٰ راہیؔ کی گہری دوستی تھی۔ اخبار کے مالک مولانا اسحٰق علمی، خان غفران زاہدی اور جمیل اختر نعمانی کی سربراہی میں غلام مرتضیٰ راہیؔ کی صلاحیت اور نکھر گئی۔ انہیں اشتہاری ایجنسیوں سے

اشتہارات کے حصول اور ایجنٹوں سے بقایاجات کی وصولی کی غرض سے مختلف صوبوں اور شہروں میں بھیجا جاتا تھا۔ جس سے ان کے مشاہدات و تجربات میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔ ۱۹۶۲ء میں یوپی گورنمنٹ روڈویز کانپور ریجن کے جنرل منیجر کے دفتر میں بطور اکاؤنٹنٹ ان کی تقرری ہوگئی۔ تو اخباری فرائض سے سبکدوشی حاصل کرلی۔

۳۱ رمئی ۱۹۶۲ء کو غلام مرتضٰی راہیؔ کی شادی سیّد عبدالقیوم کی صاحب صاحبزادی رئیس فاطمہ سے بڑی دھوم دھام سے ہوگئی۔ سیّد عبدالقیوم نے کوڑہ جہان آباد سے نقل مکانی کر کے کانپور کے غربت اللہ پارک ڈپٹی پڑاؤ میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ سیّد عبدالقیوم فتحپور کے معروف افسانہ نگار ضیاء حسنی کے رشتہ دار تھے۔ شادی کے وقت غلام مرتضٰی راہی اپنے والدین کے ہمراہ کانپور کا ایک تاریخی محلّہ پٹکاپور کے لاری پارک کے ایک مکان میں کرایہ دار تھے جو کہ مولانا غلام مصطفٰی وارثی کے قبضے میں تھا۔ غلام مرتضٰی راہیؔ کی بیگم عمر میں ان سے آٹھ برس چھوٹی ہیں۔ کافی پرکشش، خوش طبع، خوش گفتار، خوش اطوار، تعلیم یافتہ، وفا شعار، سلیقہ منداور کتائی بنائی کے علاوہ خانہ داری کے کاموں میں مہارت رکھتی ہیں۔ میں خود ان کی خوش گفتاری اور ان کے ہاتھوں سے بنائی ہوئی مختلف ڈشوں کی لذّت سے لطف اندوز ہو چکا ہوں۔ راہیؔ کے احباب میں صلاح الدین پرویز، بشیر بدر، احتشام اختر، شہاب عراقی وغیرہ اکثر ان کی اہلیہ کے ہاتھوں کے پکوانوں سے لذّتِ کام ودہن حاصل کرتے رہے ہیں۔ غلام مرتضٰی راہیؔ اپنی بیگم سے والہانہ محبت کرتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب عورتیں بچہ جننے کی صلاحیت سے محروم ہوجاتی ہیں تو مرد کا ان کی جانب سے رغبت ختم ہوجاتی ہے لیکن غلام مرتضٰی راہیؔ کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ کافی علاج ومعالجے اور دعا تعویذ کے بعد بھی جب اولاد کی دولت سے محروم رہے تب بھی اپنی اہلیہ کی محبّت میں کمی نہیں آنے دی۔ والدہ ان کی دوسری شادی کی خواہاں تھیں لیکن غلام مرتضٰی راہیؔ نے انکے ارادے کو یکسر مسترد

کردیا۔آج بھی دونوں شادمانی کی زندگی گزار رہے ہیں دونوں ایک دوسرے کے جذبے کا کافی احترام کرتے ہیں۔۱۹۸۶ء میں جب راہی پر ایک جان لیوا سانحہ گزرا بلکہ یوں کہیئے کہ موت کے منہ سے زندگی واپس لوٹی اس وقت زوجہ محترمہ ان کے ساتھ ساتھ رہیں ان کی تیمارداریوں میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔راہی بھی ان کی طرف سے بالکل غفلت نہیں برتتے۔محترمہ کی بینائی چشم بحال کرنے کیلئے کیا کیا دقیقہ نہیں اٹھایا۔اللہ کرے دونوں تاحیات کسی آفت ناگہانی میں مبتلا نہ ہوں۔

۱۹۶۴ء کے وسط میں غلام مرتضیٰ راہی کو فتحپور ڈپو میں تعینات کردیا گیا تھا۔ دس برسوں کے بعد یہ اپنے وطن لوٹے تھے۔محلہ خیلدار میں حبیب احمد کی رہائش گاہ میں بطور کرایہ دار اقامت گزیں ہوئے۔پٹی میں واقع ان کے والد کے مکان کو ایک کانسٹبل نے جعل سازی سے اپنے نام الاٹ کرالیا تھا۔۱۹۶۸ء میں مقدمہ جیت کر مکان خالی کرایا گیا۔غلام مرتضیٰ راہی فتحپور میں اور الہ آباد ۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۰ء تک اپنی سروس کی ڈیوٹی پر تعینات رہے۔۱۹۶۹ء میں راہی کو علی گڑھ کے لئے تبادلے کے احکام جاری ہوئے تھے لیکن الہ آباد کے ریجنل منیجر نے انھیں ایک سال تک روکے رکھا۔آخرکار ۸؍ستمبر ۱۹۷۰ء کو علی گڑھ میں اپنا قدم رکھا۔جہاں محلہ سرائے رحمٰن میں احمد حسین ڈپٹی رجسٹرار کی 'احمد منزل' میں چھوٹا سا فلیٹ کرائے پر لے کر رہنے لگے۔ دوسرے فلیٹوں میں مسلم یونیورسٹی کے مظہر نیازی، مبین اشرف، حبیب احمد اور شمیم احمد اپنی فیملی کے ساتھ رہا کرتے تھے۔یہ سبھی جلد ہی آپس میں گھل مل گئے ۱۹۷۲ء میں انھیں اکاؤنٹس کے شعبہ کا انچارج بنا کر علی گڑھ ڈپو بھیج دیا گیا۔راہی علی گڑھ میں اُنیس برسوں تک ڈٹے رہے بعد ازاں انہیں ۱۹۸۹ء میں پروموشن دے کر سنٹرل ورک شاپ، کانپور میں بحیثیت اکاؤنٹس آفسر تعینات کردیا گیا۔جون ۱۹۹۳ء میں سنٹرل ورکشاپ سے کانپور کے ہی ایلن فارسٹ ورکشاپ (Allen Forest

Workshop) میں تبادلہ کر دیا گیا۔ ۳۱ر مارچ ۱۹۹۵ء کو ملازمت سے سبکدوشی حاصل ہوئی۔ غلام مرتضٰی راہی نے پوری ایمانداری اور وفاداری سے اپنے فرائض منصبی کو بحسن خوبی انجام دیا۔ جہاں بھی انہیں تعینات کیا گیا ایک وفادار سپاہی کی طرح ڈٹے رہے۔ مشکل سے مشکل ترین کام کو بھی انہوں نے جہد پیہم سے آسان کر دیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ بے داغ اپنی ملازمت سے سبکدوشی حاصل کر لی۔ کبھی ان پر کوئی چارج اور نہ کوئی الزام عائد ہوئے۔ انکے فرائض منصبی سے متعلق کئی واقعات پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۹۸۲ء میں جب انہیں علی گڑھ ریجن میں دوہرا لیکھا پرنالی کی پوری ذمہ داری سونپی گئی تو ابتدا میں انہیں کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ سارا معاملہ ریاضی کا تھا اور راہیؔ ریاضی سے نابلد تھے۔ انہیں اپنے ماتحتوں سے کام لینا پڑتا تھا جس کے عوض میں وہ ناجائز فائدے اٹھانا چاہتے تھے۔ راہیؔ کو یہ ہرگز پسند نہیں تھا اس لئے ان سے نجات کا حل ڈھونڈ نکالا۔ پڑوس کے کامرس کے استاد قیوم عطا سے Double Entry System of Accounts کا ہنر سیکھا اور اتنی مہارت حاصل کی کہ پورے محکمے میں اس ہنر میں یکتا قرار دئے گئے اور انہیں انعام واکرام سے نوازا گیا۔

پہاسو ہاؤس میں واقع علی گڑھ ریجن کے ہی صدر دفتر میں غلام مرتضٰی راہیؔ ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۹ء تک تعینات رہے۔ راہیؔ پان کے بے حد شوقین تھے۔ لوگ ان کے شوق سے واقف ہو چکے تھے اس لئے دفتری کام لینے کی خاطر ان کیلئے ناظم پنواڑی سے پان کی گلوریاں بنوالاتے اور انہیں پیش کرتے۔ 'پان' کا دینا بھی رشوت کی ایک قسم میں شامل تھا یہ خیال کرتے ہوئے انھوں نے پان نوشی کی بائیس سالہ لت کو پل بھر میں ترک کر دیا۔

۱۹۸۹ء میں پہلے ٹنک پور ریجن میں راہیؔ کا تبادلہ کیا گیا تھا۔ ٹنک پور نیپال

کی سرحد پر آباد ہے۔یہاں کے نظم وضبط کی حالت بالکل غیر تھی۔رشوت ستانی، بدعنوانی اور نافرمانی عام تھی۔چائے کی جگہ پر ٹھرّا جو کہ شراب کی ایک گھٹیا قسم ہے کو پی کرلوگ دفتر میں آتے جاتے تھے۔ناجائز کمائی عام تھی۔ایسے حبس زدہ ماحول کے تصوّر سے راہیؔ گھٹن محسوس کرنے لگے ایسے میں انہیں جب سنٹرل ورکشاپ کانپور میں نئے عہدے کا انچارج بنایا گیا تو اسے خوشی خوشی قبول کرلیا۔کانپور کے سنٹرل ورکشاپ میں کارکنان کی کافی تعداد تھی اس لئے یونینوں کا کافی بول بالا تھا۔اکاؤنٹس کے شعبے کے افسران کے خلاف ان کے غم و غصّے کی وجہ یہ تھی کہ ۱۹۷۹ء میں New Pay Scale کو غیر ذمہ دارانہ اور جاہلانہ طریقے سے نافذ کیا گیا تھا جس کے نتیجے میں بہت سے Seniors کی تنخواہیں ان کے ہم منصب چھوٹوں سے کم یا مساوی ہوگئی تھیں۔بہت سے ملازمین کی تنخواہیں پہلے سے بھی کم ہوگئی تھیں۔ان کے احتجاجوں کا ابھی تک کوئی نوٹس نہیں لیا گیا تھا جس سے متاثرہ کارکنان میں مایوسی اور انتشار کا پھیلنا یقینی تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ شعبۂ اکاؤنٹس کے افسران کو کسی نہ کسی بہانے رسوا کرنا چاہتے تھے۔راہیؔ دس سال سے التوا میں پڑی اپیلوں کو نمٹانے کیلئے کمربستہ ہوگئے اور ایک ایک سیکشن کو لے کر پورے ورک شاپ کی اپیلوں پر منصفانہ فیصلے صادر کرتے ہوئے متاثرہ کارکنان کی شکایتیں دور کرنے میں کامیاب ہوگئے اور جہاں شورشرابے، ہنگامے نے اپنا ڈیرا جمالیا تھا وہاں امن اور زندہ باد کے نعرے بلند ہونے لگے۔

غلام مرتضیٰ راہی نے ۱۹۶۴ء میں باضابطہ شاعری کی شروعات کی لیکن شعر موزوں کرلینے کا ہنر ۱۹۵۳ء سے ہی حاصل ہوگیا تھا جبکہ وہ ابھی ہائی اسکول میں زیرتعلیم تھے۔ان دنوں بشیر بدر ان کے پڑوسی تھے۔بشیر بدر عبدالقدیر خاں مرحوم کے مکان میں کرایہ دار کی حیثیت سے رہتے تھے اور S. P. کے دفتر میں ملازم تھے۔بزرگ اور استاد شاعر حامد فتحپوری کے ارشد تلامذہ میں بشیر بدر کا شمار ہوتا تھا۔بشیر بدر

اور محمد طاہر کے یہاں اکثر شعری نشستیں ہوا کرتی تھیں جس میں راہیؔ بھی شرکت کرتے تھے اور یہیں سے ان کا شعری ذوق پروان چڑھا۔ان نشستوں میں حامد فتح پوری،نواب علی خاں گوہرؔ اور ساحرؔ نجمی اکثر آیا کرتے تھے۔اسی زمانے میں وہ غلام مرتضیٰ خاں سے غلام مرتضیٰ راہیؔ بن گئے۔شروع میں شاعری محض تسکین شوق کی خاطر کیا کرتے تھے ذہنی طور پر بالکل سنجیدہ نہیں تھے اور یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کی غزلیں ان کی بیاض میں محفوظ نہیں ہیں اور نہ ہی ان کی اشاعت پر خاص توجہ دی۔چند اشعار جو ان کے حافظے کی وجہ سے حاصل ہوئے وہ اس طرح ہیں۔

ابھی سے خواب منزل کے نہ دیکھو
ابھی تو فاصلہ ہی فاصلہ ہے
غبار کارواں ہے ہم سے آگے
ہمیں اس ضمن میں کچھ سوچنا ہے
گھٹا دو چند محلوں کی بلندی
کہ اس نقصان میں ہی فائدہ ہے
یوں ہی یہ آدمی کب تک چلے گا
ابھی تو گرتا پڑتا چل رہا ہے
کھنچے رہتے نہیں ہو تم ہی راہیؔ
مرا سایہ بھی مجھ سے بھاگتا ہے
کشتیِ عقل تباہی سے بچالی جائے
کوئی تدبیر جنوں ایسی نکالی جائے
حسنِ عمل میں برکتیں ہوتی ہیں بے شمار
پتھر بھی توڑیئے تو سلیقے سے توڑیئے

اب کے خزاں کا ہاتھ تھا درپردۂ بہار
ہر آرزوئے شاخِ چمن بے ثمر گئی
مظہرِ عام پہ آنا ہے سلیقے سے اگر
عارضِ وقت پہ تم زلفِ گرہ گیر بنو
صدیوں کی نیند پل میں اچٹنا محال ہے
خوابیدہ زندگی کو برابر جھنجھوڑیئے

بشیر بدرؔ کے چھوٹے بھائی محمد ضمیر الدین راہیؔ کے ہم عمر اور عزیز دوست تھے۔اس لئے بشیر بدرؔ کے یہاں سے انکا گہرا تعلق تھا۔بشیر بدر کو اکثر ایک بڑے سے مٹکے میں منہ ڈال کر گلے ٹھیک کرنے کا مشق کرتے ہوئے راہی نے دیکھا ہے۔راہی کو ادب سے گہرا شغف تھا اس لئے مشاعروں اور نشستوں میں اکثر شرکت کرتے تھے۔ لیکن شاعری کی طرف ابھی پورا جھکاؤ نہیں ہوا تھا چونکہ شاعری ذہنی یکسوئی چاہتی ہے اور راہیؔ حد درجہ مصروف رہنے والے انسان تھے۔وہ اپنی تعلیم اور زندگی کو استحکام بخشنے کی خاطر کافی مشقت کر رہے تھے۔انہوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھا۔انکے قیام وطعام کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔کالج کرنے کے بعد ٹیوشنز اور مطالعہ میں مصروف رہتے اسی میں سے کھیل کے لئے بھی وقت نکالنا ہوتا تھا۔راہیؔ کی صلاحیت اظہر من الشّمس تھی وہ اپنے ہم جماعت طالب علموں کو بھی ٹیوشن کیا کرتے تھے۔کانپور ابتداء سے ہی ادب کا گہوارہ رہا ہے۔نشور واحدی، ثاقبؔ کانپوری، شارق ایرایانی، کوثر جائسی، فنا نظامی جیسی معتبر شخصیتوں کی صحبتوں سے راہی کی تخیلی قوت میں پختگی آئی۔ابتداء میں راہیؔ نے اپنی چند نظمیں شارق ایرایانی کو اور چند غزلیں ثاقب کانپوری کو اصلاح کی غرض سے دکھائی تھیں۔ثاقب کانپوری نے اس امر کا اظہار اپنی خودنوشت سوانح عمری میں کیا ہے۔وہ زیب غوری کے بھی استاد رہے

ہیں۔اس وقت کے ادبی محفلوں میں زیب غوری، ناشاد فیض آبادی، ابولحسنات حقی، ناظر صدیقی، محمّد احمد رمز، زبیر شفائی، شاعر فتحپوری اور غلام مرتضٰی راہیؔ پابندی سے شریک ہوا کرتے تھے۔بیسویں صدی کے ساتویں دہے میں ہی راہیؔ کی تخلیقی بصیرت اور تنقیدی صلاحیت سے ادبی دنیا متعارف ہو چکی تھی۔ان کے مضامین، مقالے اس وقت کے مختلف پرچوں میں شائع ہو رہے تھے۔۱۹۶۸ء میں امرت سر کا رسالہ 'پگڈنڈی' میں عنوان چشتی کے افسانوی مجموعہ ''چاندنی کا پرتو'' پر انکا مضمون شائع ہوا۔صلاح الدین نیّر کا اولین مجموعۂ کلام 'زخموں کے گلاب' پر ایک مبسوط مقالہ ''خاتون دکن'' حیدر آباد میں ۱۹۶۸ء میں اشاعت پزیر ہوا تھا۔بشیر بدر کے شعری مجموعے 'اکائی' اور 'امیج' اور مظفر حنفی کی کتابیں ''پانی کی زبان'' اور ''اینٹ کا جواب'' پر ان کے رشحاتِ قلم ۱۹۶۸ء اور ۱۹۷۳ء میں رسائل کی زینت بنے۔راہیؔ کو بڑی شخصیتوں سے ملنے کی بڑی للک ہوتی تھی۔کانپور کے کالجوں اور لائبریری کے مشاعروں میں جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری، رَوِش صدّیقی، جوش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد، رفعت سروش، عنوان چشتی وغیرہ سے راہیؔ بالمشافہ ہو چکے تھے۔کانپور کی 'اقبال لائبریری' کیلئے فنڈ جمع کرنے کی غرض سے ۱۹۵۶ء میں کملا نہرو کلب میں ایک کل ہند مشاعرہ کا انعقاد ہوا تھا جس میں فلم اسٹار دلیپ کمار تشریف لائے تھے۔راہی نے بہت قریب سے ان کو دیکھا تھا۔اسی طرح وہ فلمی اداکار بلراج ساہنی سے بھی روبرو ہو چکے تھے۔ زیب غوری، ناظر صدّیقی، عشرت ظفر، محمّد احمد رمز، زبیر شفائی، غلام مرتضٰی راہیؔ کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ان کی تخلیقی جولانی کے قائل تھے۔

۱۹۶۸ء میں جب راہیؔ کے والد نے مقدمہ جیت کر اپنا مکان کانسٹبل سے خالی کروایا تو یہ یہیں پٹی میں والدین کے ہمراہ رہنے لگے۔دراصل راہیؔ اپنی ملازمت کے تبادلے سے دوبارہ یہاں آئے تھے۔تب یہاں کے شعری فلک میں کئی تبدیلیاں

رونما ہو چکی تھیں۔ جاذب ہسوی اور حامد فتحپوری کا انتقال ہو چکا تھا اسلئے شہر کے تمام شعراء استاذی نواب گوہر علی خاں سے مشورہ سخن کرنے لگے۔ اندر سروپ سری واستو، بیتاب پیلی بھیتی اور اخلاق مانکپوری کا ادب میں اضافہ ہو چکا تھا۔ راہیؔ کے آنے سے ادبی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا۔ اندر سروپ سری واستو بڑے فعال اور باصلاحیت شخص تھے۔ انھوں نے فتحپور میں انجمن ساہتیہ سبھا قائم کی تھی جسکی ماہانہ نشستیں پابندی سے ہوا کرتی تھیں جس میں بلا امتیاز ہندی اور اردو دونوں کے شعراء ادبا شرکت کرتے تھے۔ یہاں کی ادبی محفلوں میں راہیؔ کو پابندی سے مدعو کیا جانے لگا ابھی انکے پاس ادبی سرمائے کی کمی تھی اور نیا کہنے کا جوش بھی زیادہ نہیں تھا۔ بار بار ان محفلوں میں شرکت کرنے سے ان میں تحریک پیدا ہوتی رہی اور یہ نظموں کی طرف راغب ہونے لگے۔ ابتدا میں راہیؔ کا رجحان مشاعروں کی طرف زیادہ تھا وہ بھی جوش ملیح آبادی، کیفی اعظمی، سردار جعفری، شمسی مینائی کی طرح مشاعروں میں اپنی دھاک جما کر ڈھیر ساری دادیں وصولنا چاہتے تھے۔ لیکن استاذی نواب علی خاں گوہر، ساحر نجمی اور ضیاء حسنی کے مشورے سے رسائل کی طرف رجوع ہوئے۔ تب غلام مرتضٰی راہیؔ جی۔ ایم۔ راہی کے نام سے اپنی نظمیں ملک کے دیگر رسائل کو بھیجنے لگے۔ ان کی نظمیں اشاعت پذیر ہونے سے انکی شہرت و مقبولیت کی راہ ہموار ہونے لگی پابندی سے شب خون، ماہنامہ تحریک، ماہنامہ کتاب انکے مطالعے میں رہنے لگے ان رسالوں کی تخلیقات سے راہی محظوظ ہوئے اور متاثر بھی ہوئے۔ نئی غزل کے تئیں نئے رجحان سے ان میں نئی سوچ ابھری اور وہ غزل کی طرف مائل ہونے لگے۔ بلکہ یوں کہئے کہ غزل انکی محبوب صنف بن کر رہ گئی۔ غزل کی فنی نزاکت سے اتنے متاثر ہوئے کہ غزل کو اپنی زندگی کا بہترین وسیلہ بنا لیا۔ نظموں کی طرف سے رجحان بالکل ختم ہو گیا۔ حالانکہ نظموں میں بھی انکی انفرادیت نے قاری کو اپنی توجہ کا مرکز بنا لیا تھا۔ لیکن اب تو مشاعروں کی سطحیت، آزاد،

معرّ ا اور نثری نظموں کی روش سے انکے مزاج کی غنائیت، موزونیت اور طبعیت کی ناز کی مجروح ہونے لگی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ''نثری نظمیں کجا، مجھے تو غیر مردّف غزل بھی اس دلہن کی طرح لگتی ہے جسکی کلائیوں میں چوڑیاں نہ ہوں'' اس زمانے میں جدیدیت کے رجحان کا مبلّغ بن کر ''شب خون'' جلوہ افروز تھا اس کے زیر اہتمام 'نئے نام' کا اجرا عمل میں آیا۔ جب انھوں نے 'نئے نام' کے شعروں سے اپنے منتخب اشعار کا موازنہ کیا تو انھیں محسوس ہوا کہ اگر کچھ برسوں کیلئے غزل کی شاہراہ سے بھٹکے نہ ہوتے تو غزل کے ناموں کی فہرست انکے نام کے بغیر مکمّل نہیں ہوسکتی تھی۔

۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۴ء تک راہیؔ کے منتخب اشعار کو ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی نے اپنے مضمون ''راہی فتح پور کا نیا فاتح'' میں شامل کیا ہے جو کاروانِ ادب بھوپال میں اشاعت پذیر ہوا۔ راہی ۱۹۶۴ء میں نواب علی خاں گوہرؔ (علامہ اثر لکھنوی کے خواہرزادہ) سے مشورہ سخن کیا کرتے تھے نواب علی خاں گوہرؔ، مسلم انٹر کالج میں اردو اور فارسی کے استاد تھے۔ نغز گو شاعری تھے۔ اصلاحِ شعر کے علاوہ راہی نے فن عروض بھی استاذی سے سیکھا ہے۔

شہر فتحپور سے راہیؔ کے علاوہ سبھی ممتاز شعراء و ادباء نقل مکانی کر گئے اور پھر دوبارہ یہاں انکی مراجعت نہیں ہوئی ڈاکٹر فرمان فتحپوری ۱۹۴۹ء میں اور علامہ نیاز فتحپوری ۱۹۶۳ء میں پاکستان ہجرت کر گئے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری شہر فتح پور کے مُسلم ہائی اسکول میں طالب علم اور معلم رہے ہیں۔ فرمان فتحپوری نے مزاحیہ شاعری بھی کی ہے جس میں اپنا تخلص ''بڈّھا'' کیا کرتے تھے ڈاکٹر ابو محمّد سحر نے ۱۹۵۲ء میں بھوپال کو اپنا مسکن بنالیا تو ڈاکٹر مظفر حنفی ۱۹۶۰ء میں قصبہ سیہور بھوپال چلے گئے۔ جہاں وہ مدھیہ پردیش کے محکمہ جنگلات میں ہیڈ کلرک تھے اس کے بعد جامعہ ملیہ میں لکچرار ہوئے تو وہیں بود و باش اختیار کرلی۔ ڈاکٹر مظفر حنفی سے راہیؔ کی پہلی ملاقات ۱۹۵۹ء میں

شادی کی تقریب میں ہوئی جہاں صرف رسمی طور پر سلام کلام ہوا۔دوسری ملاقات ۱۹۶۷ء میں اس وقت ہوئی جب وہ سیہور (بھوپال) سے فتحپور آئے تھے شاعری کے میدان میں ان سے راہیؔ کو ترغیب ملتی رہی ہے ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی ممبئی کے ہو کر رہ گئے غرض کہ فتحپور کی جگمگاتی ادبی فضاء مسدود ہونے لگی لیکن غلام مرتضیٰ راہیؔ نے اپنے قلم کی جولانی سے فتحپور کا نام روشن کیے رکھا۔۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۰ء راہیؔ کو آئے دن اپنے محکمہ جاتی امور کی غرض سے الہٰ آباد جانا اور اکثر وہاں قیام کرنا ہوتا تھا۔جہاں شمس الرحمٰن فاروقی سے ان کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔بہت جلد راہیؔ نے الہٰ آباد کے شعراء ادبا سے دوستانہ تعلق قائم کر لیا جس میں سیّد عقیل رضوی، قمر احسن، نصر قریشی، نظام صدّیقی، سعید عارفی، رئیس فراز، انتخاب سیّد وغیرہم خواص تھے۔

۱۹۶۷ء میں شمس الرحمٰن فاروقی، اعجاز صدیقی (مدیر شاعر) ڈاکٹر ابو محمد سحر کے مشورے سے وہ جی۔ایم۔راہیؔ سے غلام مرتضیٰ راہیؔ بن گئے۔راہیؔ کے اوّلین مجموعہ کلام کیلئے ''لامکاں'' کا نام شمس الرحمٰن فاروقی نے ہی تجویز کیا تھا۔فاروقی کے مشورے کی بنیاد پر ہی راہیؔ نے 'لامکاں (۱۹۷۱ء)' میں صرف نئی اور منتخب غزلیں ہی شامل کی تھیں جو اشاعت کے بعد راہیؔ کی شہرت کا سبب بنیں۔فتحپور میں غزل گوئی کی ابتدا سے ہی راہیؔ کی غزلیں ملک کے مقتدر رسائل جیسے شاعر، شب خون، کتاب، تحریک، آجکل، نیا دور، شعر و حکمت اور آہنگ میں شائع ہونے لگیں جس سے ادبی حلقوں میں راہیؔ کی خوب خوب پذیرائی ہونے لگی۔راہیؔ کے فتحپور کے ۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۰ء کے دورانِ قیام یہاں کے شعراء ادبا میں رسائل میں اپنی تخلیقات چھپوانے کی ہوڑ لگی ہوئی تھی۔ادبی سرگرمی زوروں پر تھی۔نو آموز شعراء و ادبا اپنے سے بزرگ کو استاد کا درجہ دیتے تھے اور ان کا ادب و احترام کیا کرتے تھے۔عبد الرؤف خاں، سعید احمد مدنی، نواب فیّاض حسین اور سیّد متین الدّین عثمانی شہر کے مشہور قانون داں اور ادب نواز

تھے۔عبدالرؤف خاں سابق ایم۔ایل۔اے ہر سال مشاعرے کا اہتمام کیا کرتے تھے ایک بار ایک مشاعرہ میں غلام مرتضٰی راہی کے ہم نام ڈی۔ایم تشریف فرما تھے۔ غلام مرتضٰی راہی نے اپنی ایک نظم 'اے میرے وطن' پڑھ کر انکی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ڈی۔ایم صاحب انکی شاعری سے کافی متاثر ہوئے۔دوسرے دن راہی نے اس تازہ تاثر سے فائدہ اٹھانا چاہا۔جیسا کہ سطور اولین میں تحریر کیا تھا کہ ایک کانسٹبل نے نقلی کاغذات بنوا کر راہی کے والد کے مکان پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔اس معاملے کی جانکاری راہی نے ڈی۔ایم صاحب کو دی۔ اسی وقت ڈی۔ایم غلام مرتضٰی نے ٹیلیفون پر سپریٹینڈنٹ آف پولیس سے عدالت کی مسلسل حکم عدولی پر اپنی تشویش کا اظہار کیا اور ساتھ ہی مکان کے تخلیہ کو فی الفور یقینی بنانے کیلئے ضروری اقدامات کرنے کی ہدایت دے ڈالی۔دوسرے دن راہی کے مکان کو کانسٹبل کی زد سے آزاد کرادیا گیا اور اس پر اب راہی کے والد کا قبضہ ہوگیا۔غلام مرتضٰی راہی کا تبادلہ اب علی گڑھ ہوگیا تھا۔اسلئے ۸ رستمبر ۱۹۷۰ء کو راہی نے پہلی بار علی گڑھ کی سرزمین پر قدم رکھا تھا علی گڑھ میں ۱۹ برسوں تک راہی اقامت گزیں رہے۔علی گڑھ ایک تاریخی شہر ہے اسے سرسید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک نے پوری دنیا میں روشناس کرایا۔اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وجہ سے مسلمانوں میں تعلیمی شعور جاگا ہے ہمارا معیارِ تعلیم اونچا ہوا ہے اور ہم ہر شعبے میں سرخرو ہوئے ہیں۔علی گڑھ کے عقیدت مندوں کی کمی نہیں ہے، رشید احمد صدیقی تو علی گڑھ کے مداح ہیں۔کہا جاتا ہے کہ جس شئے سے انسیتِ خاص ہوتی ہے اسکا ذکر جلوت وخلوت ہر جگہ کیا جاتا ہے یہی حال رشید احمد صدیقی کا ہے۔وہ اپنی تحریروں میں علی گڑھ لفظ کا استعمال ضرور کیا کرتے ہیں۔علی گڑھ انکی کمزوری بن کر رہ گئی ہے۔ رشید احمد صدیقی اپنی کتاب 'آشفتہ بیانی میری' میں رقم طراز ہیں۔

''میری تحریروں میں یہ نقص بتایا جاتا ہے کہ ان میں علی گڑھ بہت ہوتا ہے اسلئے

وہ لوگ جو علی گڑھ سے کم یا بالکل واقف نہیں ہوتے انکو ان مضامین یا اسطرح کی باتوں سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس حرکت سے بعض احباب مجھ سے چڑنے بھی لگے ہیں ان سب سے مجھے بھی ایک شکایت ہے وہ یہ کہ وہ خود علی گڑھ سے کیوں واقف نہیں! اردو جاننا اور علی گڑھ سے واقف نہ ہونا بجائے خود کسی فتور کی علامت ہے۔ اردو کا نام علی گڑھ بھی ہے۔ کسی اجنبی سی ملاقات ہوتی ہے اور اسکے طور طریقوں سے خوش ہوتا ہوں تو اکثر پوچھ لیتا ہوں کہ وہ کبھی علی گڑھ کا طالب علم رہا ہے یا نہیں۔ ہوتا ہے تو اسکے خوش اوقات خوش مذاق ہونے پر تعجب نہیں ہوتا۔ ورنہ افسوس ہوتا ہیکہ وہ اس نعمت سے بھی کیوں محروم رہا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ علی گڑھ کا ایک خاص رنگ، رکھ رکھاؤ یا ٹھسّا ہوتا ہے جو اسے دوسروں سے ممتاز یا متمائز کرتا ہے'' [1]

علی گڑھ ادب کا مرکز مانا جاتا ہے۔ خلیل الرحمن اعظمی، ڈاکٹر وحید اختر، شہر یار پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری۔ پروفیسر ساجد زیدی' پروفیسر زاہدہ زیدی، ڈاکٹر وارث کرمانی، ابوالکلام قاسمی، اسعد بدایونی (مرحوم)، صلاح الدین پرویز، اصغر عباس، پروفیسر خورشید الاسلام، بشیر بدر، شمیم حنفی، مختار ہاشمی، قاضی عبدالستار ذوقی، ڈاکٹر اختر انصاری، رشید احمد صدیقی، جذبی، غوث محمّد غوثی اور غلام مرتضیٰ راہی جیسی مقتدر اور معتبر شخصیتوں کا تعلق علی گڑھ سے رہا ہے۔

غلام مرتضیٰ راہی جب پہلی بار علی گڑھ آئے تو شمس الرحمن فاروقی کا ایک سفارشی رقعہ لیکر خلیل الرحمن اعظمی کے دولت کدے پر حاضر ہوئے خلیل الرحمن اعظمی نے بڑی خوشدلی کا اظہار کیا۔ انھیں ڈاکٹر وحید اختر اور شہر یار سے ملوایا۔ پھر راہی کا آرٹس فیکلٹی میں آتے جاتے رہنے سے پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، ڈاکٹر وارث کرمانی، شمیم حنفی، ابوالکلام قاسمی، فیاض رفعت،

---

[1] آشفتہ بیانی میری۔ رشید احمد صدیقی،

اسعد بدایونی، اصغر عباس، صلاح الدین پرویز، امیر عارفی، شمسی طہرانی، فوق کریمی، معظم علی، احتشام اختر، شہاب الدّین عراقی، شہپر رسول، مرزا خلیل، منظور ہاشمی وغیرہ سے شرفِ ملاقات نصیب ہوا اور پھر انکے بہت قریب ہوگئے۔ اسعد بدایونی دورِ جدید کے اہم شاعر تھے انکی شاعری عہدِ حاضر کی بولتی ہوئی زبان تھی۔ بہت جلد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اسعد بدایونی کا پہلا مجموعہ کلام ''دھوپ کی سرحد'' ۱۹۷۷ء میں منظرِ عام پر آیا۔ جس میں غلام مرتضیٰ راہی کی انکی شاعری کی تعلق سے رائے شامل تھی۔ راہی مذکورہ بالا شخصیتوں سے اکثر ملاقات کیا کرتے تھے اور وہ لوگ بھی انکی غزلوں کو بیحد پسند کیا کرتے تھے۔ شعبہ اردو کی شعری نشستوں، سیمیناروں اور کلچرل پروگراموں میں راہیؔ کو مدعو کیا جانے لگا راہیؔ بھی ان محافل میں اپنی کامیابی کو یقینی بنانے کی ہر ممکن جہد کرتے تھے۔ علی گڑھ کی مزمّل منزل کے احاطے میں واقع ملازمین کے کوارٹروں میں سے ایک میں بشیر بدر اپنے اہل وعیال کیساتھ رہ رہے تھے یہیں بشیر بدر سے راہیؔ کی ملاقات تیرہ چودہ برسوں کے بعد ہوئی تھی۔ بشیر بدر پروفیسر آل احمد سرور کی نگرانی میں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کر رہے تھے۔ ان کا موضوع تھا'' آزادی کے بعد اردو غزل''۔ شہر یار ان دنوں انجمن ترقی اردو کے دفتر میں لٹریری اسسٹینٹ تھے اور پروفیسر آل احمد سرور اس کے سکریٹری تھے۔ بعد میں خلیق انجم سکریٹری بنے۔ اسکے بعد انجمن کا دفتر دہلی منتقل ہوگیا۔ علی گڑھ آنے سے قبل انہیں علی گڑھ کی تین مشہور چیزوں کے بارے میں جانکاری مل گئی تھی۔ ان تینوں اشیاء کے نام 'میم' سے شروع ہوتے تھے۔ یہ تینوں چیزیں تھیں مچھر، مٹری (بسکٹ کی ایک قسم) اور مسلم یونیورسیٹی۔ مچھروں نے پہلی فرصت میں راہیؔ پر حملہ کر ڈالا اور بری طرح ملیریا کا مریض بنا ڈالا۔ انہیں طبیہ کالج کے اسپتال میں داخل کیا گیا جہاں بشیر بدر، احتشام اختر اور شہاب الدین عراقی عیادت کے لئے آیا کرتے تھے۔ علی گڑھ کے محلّہ سرائے رحمٰن میں ڈپٹی رجسٹرار احمد حسین کی 'احمد منزل' میں کرائے پر ایک چھوٹا سا

فلیٹ حاصل ہو گیا۔دوسرے فلیٹوں میں مسلم یونیورسیٹی کے مظہرحسین نیازی ،مبین اشرف، حبیب احمد اور شمیم احمد اپنی فیملی کے ہمراہ رہا کرتے تھے۔ادھر راہی بھی اپنی اہلیہ کو لے آئے تھے۔اور سبھی مزے مزے زندگی کے لمحات گزار رہے تھے۔یہاں غوث محمد غوثی انکے پڑوسی تھے۔قاضی عبدالستار کے مطابق ''جذبی اور اختر انصاری کے بعد علی گڑھ کے تیسرے بڑے شاعر کا نام غوث محمد غوثی ہے''۔غوثی ایک قادرالکلام شاعر تھے۔راہی کی صحبت سے انکی غزلوں میں جدید رنگ و آہنگ پیدا ہوا۔انکے دو مجموعے منظر عام پر آکر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔پہلا مجموعہ ''عکس آئینہ'' ۱۹۸۵ء میں منظر عام پر آیا جس کا انتخاب غلام مرتضیٰ راہی نے دیکھا تھا۔دوسرا مجموعہ ''دھنک لہجے کی'' ۱۹۹۱ء میں منصۂ شہود پر آیا۔محلّہ سرائے رحمٰن کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اپنے وقت کے معتبر شعراء ادباء وہاں اقامت گزیں رہے ہیں۔جن میں خلیل الرحمٰن اعظمی ،شہریار، امانت اللہ اسیر، غوث محمد غوثی، ثمر چھتاروی اور رمز آفاقی گنوری کے نام نامی خاص ہیں۔امانت اللہ اسیر کا مجموعہ کلام ''صدائے عرش گیر'' ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا۔انہیں رباعیات کہنے میں قدرت حاصل ہے۔ثمر چھتاروی ایک تاریخ گو تھے اور غلام مرتضیٰ راہی سے مشورہ سخن کیا کرتے تھے۔جامعہ اردو علی گڑھ کے طرز پر اردو بورڈ کے سالانہ امتحانات کا اہتمام کرتے تھے اور ان کاموں میں راہی ان کی مدد کیا کرتے تھے۔

شہر اور یونیورسیٹی کے شعراء و ادباء کی پسندیدہ جگہ بالائے قلعہ (اپر فورٹ) کے اسکائی لارک ریستورانت میں علی گڑھ کے مشہور و معروف استاد شاعر مختار ہاشمی اور انکے تلمیذ خاص جمنا پرشاد راہی سے غلام مرتضیٰ راہی کی ملاقات ہوئی تھی۔جمنا پرشاد اور راہی دونوں برسوں برس تک یار غار بن کر رہے۔ایک شعر ملاحظہ کیجئے

ایک نیام میں دو تلواریں
کاٹ الگ، الگ جھنکاریں

یہاں مصرعۂ اولیٰ جمنا پرشاد نے اور مصرعہ ثانی راہیؔ نے پورا کیا ہے۔ جمنا پرشاد نے اپنے مجموعۂ کلام ''سرابوں کی فصل'' میں اس شعر کو غلام مرتضٰی راہیؔ کی نذر کیا ہے۔ مختار ہاشمی راہیؔ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ انکے مجموعۂ کلام ''گردشِ رنگ'' کی ترتیب وتزئین میں راہیؔ کا اہم رول رہا ہے۔ مختار ہاشمی ابراحسنی گنوری کے شاگرد عزیز تھے۔ ساحل احمد بی۔ایڈ۔ کے لئے علی گڑھ آئے تھے یہ راہیؔ کے پڑوسی محمد طاہر فتحپوری کے حقیقی خواہر زادہ تھے۔ انکا تعارف وہاں کے ادبی حلقوں میں راہیؔ نے ہی کروایا تھا۔ ساحل احمد جب تک علی گڑھ میں رہے غلام مرتضٰی راہیؔ سے مشورۂ سخن کرتے رہے۔ سردانہ منتظرؔ ریلویز کے اعلیٰ افسر اور نغز گو شاعر تھے۔ راہی سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے۔ سردانہ منتظرؔ کے بنگلے میں ۱۹۷۶ء میں ایک یادگار شعری نشست ہوئی تھی جسکی صدارت ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے کی تھی۔ راہیؔ اس نشست کے کنوینر تھے۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی صحت کی خرابی کے باوجود راہیؔ کی محبت میں یہاں آ گئے تھے۔ اس نشست کے شرکاء میں ڈاکٹر وحید اختر، شہر یار، شمیم حنفی، جمنا پرشاد راہیؔ، اسعد بدایونی، مختار ہاشمی، فوق کریمی اور غوث محمد غوثی تھے۔ سردانہ منتظرؔ کا تبادلہ دہلی مین ہو گیا تھا۔ لیکن علی گڑھ جب بھی آتے تو راہیؔ سے ضرور ملاقات کرتے۔ شمس الرحمٰن فاروقی جب علی گڑھ کی طرف رخ کرتے تو غلام مرتضٰی راہیؔ کو اس کی اطلاع ضرور دیتے۔ وہ یونیورسیٹی گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرتے تھے جہاں راہیؔ کے علاوہ صلاح الدین پرویز، احتشام اختر، جمنا پرشاد راہیؔ، محمود ہاشمی اور دیگر احباب کے ساتھ دیر رات تک محفلیں جمتی تھیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی غلام مرتضٰی راہیؔ کو چند اچھے لکھنے والوں میں شمار کرتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے شب خون کا در ہمیشہ کھلا رکھا۔ انکی شاعری کو بہ نظر استحسان دیکھا اور اپنی مثبت رائے سے انہیں سرفراز کیا۔ راہیؔ کا اولین مجموعہ کلام 'لامکاں' جو ۱۹۷۱ء میں منظر عام پر آیا۔ اسکی اشاعت کے بعد غلام مرتضٰی راہیؔ کے

رنگ و آہنگ، فکری جہت، اور شعری دبازت سے پوری ادبی دنیا روشناس ہو چکی تھی۔ اس لئے اساتذہ اور عمائدین شہر مخصوص ادبی پروگراموں میں راہیؔ کو ضرور مدعو کرتے تھے۔علی گڑھ میں ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی راہیؔ کے لئے سب سے محترم اور معنوی بھائی کی طرح تھے۔شہر یار سے گہری انسیت تھی۔ان دونوں سے انکے گھریلو مراسم تھے۔ راہیؔ کے دوسرے مجموعۂ کلام 'لاریب' کا مسودہ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کا دیکھا ہوا ہے۔راہیؔ انہیں اپنا Promoter اور Booster تسلیم کرتے ہیں۔'لاریب' ۱۹۷۳ء میں منصۂ شہود پر آیا۔ جسے 'لامکاں' کی اگلی منزل قرار دیا گیا تھا۔ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی اپنے ذاتی مکان ''اردو باغ'' میں اپنی اہلیہ راشدہ خلیل، بیٹے کامران، سلمان، عدنان اور سب سے چھوٹی بیٹی ہما پروین کے ساتھ رہ رہے تھے۔اعظمی کو بلڈ کینسر ہو گیا تھا۔آخر کار یکم جون ۱۹۷۸ء کو ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

دہلی کے ریڈیو پروگراموں کی رکارڈنگ میں ابتداء میں دو تین بار بشیر بدر نے انکی رہنمائی کی تھی۔ اس وقت سلام مچھلی شہری اردو کے پروگرام انچارج تھے۔ انہیں پینے پلانے کا شوق تھا۔راہیؔ نے جب ایسا کرنے سے انکار کیا تو جب تک وہ انچارج رہے راہیؔ کو ریڈیو پروگرام نصیب نہیں ہوا۔

۱۹۷۴ء میں علی گڑھ میں مولانا ابر احسنی گنوری کا سہ روزہ جشن منایا جارہا تھا جس میں ہزاری باغ سے ظہیر غازی پوری نے شرکت کی تھی۔ظہیر غازی پوری ابر احسنی گنوری کے تلمیذ خاص میں شمار کئے جاتے ہیں۔ظہیر غازی پوری کا نام پوری ادبی دنیا میں احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔راہیؔ کو ابتدا سے ہی جاننے اور ماننے والوں میں ظہیر غازی پوری کا نام لیا جاتا ہے۔انہوں نے راہیؔ کے کلام کو ہمیشہ بنظر استحسان دیکھا ہے۔اس جشن میں ان سے شرف ملاقات نصیب ہوا۔

خواجہ مسعود حسن ذوقی اور ڈاکٹر اختر انصاری جو کہ مسلم یونیورسیٹی کے بزرگ

اور برگزیدہ استاذ تھے ان سے غلام مرتضیٰ راہی کافی مانوس رہے۔ ان حضرات کی عالمانہ گفتگو کی کشش نے راہی کو بہت قریب کرلیا تھا۔ اختر انصاری کا ایک شعر تو لوگوں کی زبان پر بالکل ازبر ہو چکا ہے۔

یاد ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

رئیس الدین رئیس اس وقت نو آموز شاعر تھے جو جمنا پرشاد راہی کے تلمیذ خاص تھے وہ اکثر غلام مرتضیٰ راہی کے رسُل گنج میں واقع کرایہ کے مکان میں آیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے دوسرے مجموعۂ کلام ''زمین خاموش ہے'' کا دیباچہ لکھوانے کے لیے راہی سے رجوع کیا تھا۔

حیرت بن واحد پورے علی گڑھ اور یونیورسیٹی کیمپس کے ایک دلچسپ انسان تھے۔ وہ یونیورسیٹی کے جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج کے کسی آفس میں ملازم تھے۔ آئے دن ان کا کسی نہ کسی سے جھگڑا ہو جایا کرتا تھا۔ اس جرم میں انہیں نوکری سے برخاست کر دیا گیا تھا۔ حیرت بن واحد بیجا طور پر بلند بانگ دعوے کیا کرتے تھے۔ جس سے وہ شہر میں ناقابل اعتبار شخص تسلیم کیئے جاتے تھے۔ ایک دفعہ جب غلام مرتضیٰ راہی اپنے اہل خانہ کے ساتھ خواجہ اجمیری کی درگاہ کی زیارت کو جا رہے تھے تو حیرت بن واحد نے اپنے لیٹر پیڈ پر درگاہ کے معطّل سجادہ نشیں کے نام ایک سفارشی رقعہ لکھ کر دیا۔ راہی نے بے اعتنائی کے عالم میں اسے جیب میں رکھ لیا۔ راہی اجمیر پہنچ کر جب درگاہ میں کمرے کے حصول کی خاطر پریشان ہو گئے تب انہیں حیرت بن واحد کا رقعہ یاد آیا وہ رقعہ لے کر متذکر سجادہ نشیں کے پاس گئے تو ان کی خاطر خواہ عزت و تکریم کی گئی۔ ایک عمدہ سا کمرہ الاٹ کیا گیا اور ہر طرح کے آرام و آسائش کا عمدہ انتظام کیا گیا۔ حیرت بن واحد کا سفارشی رقعہ بڑا کام آیا اور راہی ان کے بلند بانگ دعوے کا

قائل ہو گئے۔

صلاح الدین پرویز سے غلام مرتضیٰ راہی کی گہری انسیت تھی۔ وہ صلاح الدین پرویز کو بہت پسند کرتے تھے۔ اچانک وہ تعلیم ادھورا چھوڑ کر اپنے بڑے بھائی کے پاس امریکہ چلے گئے پھر سعودی عرب کے شہر ریاض کے لئے روانہ ہو گئے وہاں سے کئی برسوں بعد لوٹنے پر ان کا ہاؤ بھاؤ تبدیل ہو گیا تھا۔ وہ ایک امیر آدمی بن کر لوٹے تھے۔ جب راہی سے ملنے آئے تو انکے شعری مجموعہ چھپوانے کے عزم کا اظہار کیا۔ جب دوسری بار ریاض سے لوٹ کر ملنے آئے تو اپنی کمپنی میں تقرری کی پیشکش کی لیکن اس وقت تک راہی اپنے محکمہ میں اسسٹینٹ اکاؤنٹس افسر کی گزیٹیڈ پوسٹ پر پہنچ چکے تھے۔

۷۷۔۱۹۷۶ء سے غلام مرتضیٰ راہی کی ادبی جولانی سرد پڑتی گئی۔ یہاں تک کہ ۱۹۸۰ء کے بعد شاعری ان سے چھوٹ گئی۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ سب سے اہم وجہ تاش کے کھیل ''برج'' سے جنون کی حد تک انکی دلچسپی تھی۔ اس کھیل میں مسلم یونیورسٹی اسٹاف کلب، علی گڑھ کلب اور سِول کورٹ کلب میں ان کے زیادہ تر اوقات گزرنے لگے۔ اسی اثنا میں میرٹھ کی ایک شاعرہ نے ان سے قلمی رابطہ قائم کیا۔ پھر ملنے کی سبیل بھی نکلنے لگی۔ محترمہ کی تخلیقات کو بنانے اور سنوارنے میں ان کا خاصہ وقت صرف ہوتا تھا، یہ ان کے تخلیقی جوہر کا بے جا مصرف تھا۔ ۱۹۸۲ء میں انھیں اپنے محکمہ کی جانب سے ایک اور ترقی دیکر علی گڑھ ریجن میں دوہرا لیکھا پرنالی کے نفاذ کو پوری طرح یقینی بنانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ راہی کو ریاضی میں کوئی دلچسپی نہ تھی اور یہ سارا کام ریاضی سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کام کے نفاذ کیلئے انھیں اپنے ماتحتوں پر انحصار کرنا پڑتا تھا اور یہ کارکنان انکی کمزوری سے ناجائز فائدے لینے کے خواہاں تھے جو کہ انکے خمیر میں شامل نہ تھا اس لئے انھوں نے تمام مشاغل کو بالائے طاق رکھ کر اپنے پڑوسی

قیوم عطا سے ڈبل انٹری سسٹم آف اکاؤنٹس کی تعلیم حاصل کرنے لگے بڑی دلجمعی سے اس کام کو سیکھا اور پورے محکمے میں اس ہنر میں ماہر ثابت ہوئے۔انھیں قابل تحسین کارکردگی پر کئی بار انعام واکرام سے نوازا گیا۔اس مصروفیت نے تو ادب کی طرف جھانکنا بھی محال کر رکھا تھا جس سے انکی شاعری اور تخلیقی ذہن کی فعالیت کافی متاثر ہوئی۔

۳۱/جنوری ۱۹۸۶ء کو غلام مرتضیٰ راہیؔ پر ایک جان لیوا سانحہ گذرا۔انھیں جواہر لال نہرو میڈیکل کالج میں داخل کرایا گیا جہاں وہ ۱۹/اپریل ۱۹۸۶ء تک زیر علاج رہے۔اس حادثے میں انکے دل ودماغ،ناک،کان،جلد اور تمام انگلیاں متاثر ہوئیں۔بمشکل اللہ کے کرم سے ڈاکٹروں کی محنتوں اور احباب کی جاں فشانیوں نے انھیں موت کے منھ سے کھینچ نکالا۔گینگرین کے سبب ان کے داہنے ہاتھ اور بائیں پاؤں کی متعدد انگلیوں کو جزوئی طور سے تراش دیا گیا۔ناک کا نقشہ بھی متاثر ہوا۔اسپتال سے آنے کے بعد مستقل آرام کی ضرورت تھی اور ذہنی بار سے بھی دور رہنا تھا۔اس طرح تخیّلاتی دنیا سے کنارہ کشی ضروری ہوگئی تھی۔یہی تساہلی اور 'تاش' کی لت تھی، جس سے پندرہ برسوں تک ادب کی دنیا سے تائب رہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ممتاز پروفیسر ساجدہ زیدی سے راہیؔ کے تعلقات بہت اچھّے تھے۔ساجدہ زیدی بے حد ذہین،معاملہ فہم اور دردمند خاتون تھیں اکثر شہر کے مشہور اسکائی لارک ریسٹورنٹ میں وہ شعراء وادبا کی بھیڑ میں ہنستی مسکراتی اور سگریٹ کے مرغولے بناتی نظر آتی تھیں۔پروفیسر ساجدہ زیدی راہیؔ پر شفقت کی نگاہ رکھتی تھیں۔زاہدہ زیدی ساجدہ زیدی کی ہمشیرہ تھیں۔اردو ادب میں انھوں نے بھی کافی نام کمایا ہے۔لوگ انھیں تنک مزاج اور مغرور سمجھتے تھے۔ان کے ساتھ بھی راہیؔ کا مخلصانہ تھا۔

آخرکار علی گڑھ میں (۱۹) اُنیس برسوں تک قیام کے بعد ان کا ٹرانسفر ٹنک پور کے بعد کانپور کر دیا گیا تھا۔ کانپور سے راہی کا دیرینہ لگاؤ رہا ہے۔ جسکا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے چونکہ شعر و شاعری سے پندرہ برسوں تک قطع تعلق رہا۔ اس لئے کانپور کے نو آموز شعراء ادباء غلام مرتضیٰ راہی سے واقف نہ تھے۔ یہاں کے بیشتر بزرگ شعراء جن سے راہی کی رسم و راہ تھی وہ دنیا سے رحلت فرما چکے تھے۔ ۱۹۹۴ء کی ایک شعری نشست جو عائشہ صدیقہ گرلز کالج میں منعقد ہوئی تھی اس میں راہی نے شرکت کی تھی۔ جہاں نئی نسل کے شعراء موجود تھے۔ راہی کو بغیر تعارف کے دعوت سخن دیدی گئی تھی لیکن پروفیسر ابوالحسنات حقی نے سامعین سے غلام مرتضیٰ راہی کو 'لا مکاں' اور 'لاریب' کے حوالے سے متعارف کرایا اور انکی شاعری، رنگ و آہنگ اور لب و لہجے پر تفصیلی گفتگو کی۔ راہی نے جب اپنی غزلیں سنائی تو داد و تحسین اور فرمائش کی جھڑی لگ گئی۔ کانپور کی ادبی محفلوں میں راہی کو خصوصی مہمان کی حیثیت سے مدعو کیا جانے لگا۔ ۱۹۹۴ء کے اواخر تک انکی طبیعت کلّی طور پر شعر گوئی کی طرف مائل ہوگئی اس طرح تخلیقی جمود کے ٹوٹتے ہی انہوں نے رسائل میں چھپنے چھپانے کی طرف توجہ دی۔ ملک کے مستند رسائل کے مدیروں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور انہیں اپنے پرچوں میں اہمیت کے ساتھ شائع کرنا شروع کر دیا جن میں خصوصاً شمس الرحمٰن فاروقی نے 'شب خون' میں افتخار امام صدیقی نے 'شاعر' میں مخمور سعیدی نے 'ایوان اردو' میں محبوب الرحمٰن فاروقی نے 'آج کل' میں اور شاہنواز قریشی نے 'نیا دور' میں اہم مقام عطا کیا۔

۳۱/مارچ ۱۹۹۵ء کو غلام مرتضیٰ راہی اپنی ملازمت سے سبک دوش ہو گئے اب تو پوری آزادی تھی پورے طور پر انہوں نے خود کو ادب کے حوالے کر دیا ہے۔ لکھنے پڑھنے کا سلسلہ زور و شور سے جاری و ساری ہے۔ راہی کے وظیفہ یاب ہونے پر کانپور کے مستند ادبی سرکل 'ادب عالیہ' کے زیر اہتمام عرشی گرلز انٹر کالج کانپور میں ایک الوداعیہ

اور شعری نشست کا انعقاد کیا گیا تھا۔ جس میں ڈاکٹر مغیث الدین فریدی، علامہ کوثر جائسی، ڈاکٹر مظفر حنفی اور پروفیسر ناز قادری کے علاوہ اکابرین ادب پروفیسر ابوالحسنات حقی، نامی انصاری، عشرت ظفر، ناظر صدیقی، محمّد احمد رمز، زبیر شفائی، شاعر فتح پوری، فاروق جائسی، غلام مصطفیٰ فراز اور اسلم محمود شریک ہوئے تھے۔ اس تقریب میں ادب عالیہ کے جنرل سکریٹری ناظر صدیقی، معاون سکریٹری شاعر فتح پوری اور سکریٹری رابطہ عامہ فاروق جائسی کی جانب سے مشترکہ سپاس نامہ پیش کیا گیا تھا، جو ان الفاظ میں ادا کیا گیا تھا۔

''غلام مرتضیٰ راہی نے جب شاعری کا سفر شروع کیا، بڑے اضطراب و انتشار کے دن تھے۔ صاف لگتا تھا کہ ایک لاوا اپنے بہاؤ کے لئے سمت و جہت کی تلاش میں ہے۔ ہم گواہ ہیں کہ راہی ان دنوں اپنی صبح و شام کے تناظر بدلتا رہتا تھا۔ ذات کی تلاش میں ذات کی ٹوٹ پھوٹ کے ایسے منظر ہم نے اپنے ہم عصروں میں نہیں دیکھے تھے۔ لیکن روایتی ذہن اور اسالیب کے ساتھ شاعری شروع کرنے والا راہی ذات کے سراغ میں دو سال سے بھی کم عرصے میں باقاعدہ جدیدیت کے حصار میں آ گیا تھا۔ وہ اپنی رو، رفتار اور آہنگ قدم کا تنہا مسافر تھا اسنے لہجے کی بے ساختگی کی حد تک جدیدیت کا اتباع کیا۔ اس نے جدیدیت کے شارحین کو حرف غلط کی سی بھی اہمیت نہیں دی۔ انتشار ذات کے ان لمحوں میں سچی اور چمک دار جدیدیت اور جدید شاعر کا سراغ پا لینا غلام مرتضیٰ راہی کا کرشمہ ہے کہ اس کو نئی غزل کی تاریخ میں اپنی نشست بھی تو محفوظ کرنی تھی۔ راہی نے لفظوں کو لہجے کی گرفت میں دیکر نئی معنویت سے آشنا کیا۔ اس کی شاعری میر صاحب کے آہنگ کا نشاۃ ثانیہ کہی جا سکتی ہے۔ اس حد تک کہ لفظ شاعری کے اندرون کا ذاتی نقیب و مظہر بن جائے۔ راہی نے اپنی شاعری سے محاوروں کو نئے اطراف و جہات عطا کئے ہیں۔ اللہ اسے انہماک اور تراوش خون جگر کا

صلہ دے''۔[1]

ملازمت سے سبک دوشی کے بعد راہیؔ مستقل طور پر علی گڑھ میں بود و باش اختیار کرنا چاہتے تھے کیونکہ انہوں نے اپنی عمر کے ۱۹ برس وہاں گزارے تھے۔علی گڑھ کے چپّے چپّے سے راہی مانوس ہو چکے تھے۔اس شہر سے انہیں ایک جذباتی لگاؤ ہو گیا تھا۔رشید احمد صدیقی کے بعد یہ دوسری ادبی شخصیت تھی جنہیں علی گڑھ بے حد بھاتا تھا۔کانپور بھی انکا پسندیدہ شہر تھا۔کانپور سے انکا ددھیالی،ننھیالی،اور سسرالی رشتہ تھا۔محلّہ جاجمو میں خود اپنے نسبتی برادر کے یہاں اوپری منزل پر مکان بنوا کر مقیم تھے۔عزیز واقارب کی کمی نہ تھی لیکن جیسا کہ میں نے پہلے ہی ذکر کیا ہے کہ غلام مرتضیٰ راہیؔ لاولد تھے اور عمر کے آخری پڑاؤ میں سہارے کی ضرورت تھی۔اس خیال سے انہوں نے اپنا آبائی شہر فتحپور میں رہنا مناسب سمجھا۔فتحپور کانپور سے صرف ۷۶ کیلومیٹر پر واقع تھا۔یہاں ان کے چھوٹے بھائی اپنی پوری فیملی کے ساتھ رہتے تھے۔فتحپور سے متصل ہی کنور پور میں ان کے چچا محترم اپنے کنبے کے ساتھ آباد تھے۔وہاں کی ہر چیز دیکھی بھالی تھی۔راہی کے لئے یہاں ایک مانوس،آزاد اور سازگار فضا تھی۔گھر کا بزرگ اور مکھیا ہونے کا بھی انہیں اعزاز حاصل تھا۔بھائی،بھتیجے بھی ان کے لئے نرم گوشہ رکھتے تھے ان ساری باتوں کا خیال کرتے ہوئے راہیؔ صاحب نے فتحپور میں ہی رہنے کا حتمی فیصلہ کر لیا اور آبائی مکان کے ایک چوتھائی حصے میں ''راہی منزل'' نامی دو منزلہ عمارت کی تعمیر کروائی اور دونوں میاں بیوی ۲۷ر ستمبر ۱۹۹۵ء کو کانپور سے آ کر یہیں اقامت گزیں ہو گئے۔۱۹۹۶ء کی ایک شام انکی اہلیہ محترمہ زینے سے پھسل گئیں جس سے پاؤں میں فریکچر آ گیا۔تقریباً ڈھائی ماہ تک پاؤں میں پلاسٹر چڑھا رہا اس اثنا میں گھر کی بہو بیٹیوں نے کافی تیمارداری کی۔اور انکے کام کاج کو بخوبی سنبھالے رکھا۔تب

---

[1] سپاسنامہ۔۔۔ناظر صدیقی،شاعر فتحپوری،فاروق جائسی کی جانب سے پیش کردہ

انہیں فتحپور میں مستقل طور پر اقامت گزینی ہونے کا فیصلہ صحیح ثابت ہوا۔اب غلام مرتضیٰ راہی کو لکھنے پڑھنے کے کافی مواقع حاصل تھے۔ملازمت کی آپا دھاپی سے بالکل آزاد تھے۔لیکن فعال آدمی کبھی خاموش نہیں بیٹھتا۔اس لئے جب انہیں فتحپور کی ملّی رفاہِ عام سوسائٹی کا نائب صدر منتخب کیا گیا تو انہوں نے بغیر چوں چرا کئے اس عہدے کو تسلیم کرلیا۔ضیاء حسینی اس سوسائٹی کے صدر تھے۔ملّی رفاہ عام سوسائٹی شہر کی بڑی فعال سوسائٹی ہے اس کے ماتحت تعمیر شدہ نور الہدیٰ انگلش میڈیم ہائی اسکول دیکھنے اور سراہنے کی چیز ہے۔تحقیقی مواد کی فراہمی کی خاطر جب میرا فتحپور آنا ہوا تو نور الہدیٰ اسکول کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور جائزہ لینے کا شرف حاصل ہوا۔میرے ہمراہ جناب رونق شہری بھی تھے۔ایک ایک کلاس روم، لائبریری، آفس، ہوسٹل، کھیل کے میدان کا دیدار اپنی آنکھوں سے کیا۔وسیع احاطے پر محیط، اعلیٰ تعلیمی معیار سے مزین آراستہ و پیراستہ نور الہدیٰ ہائی اسکول کو دیکھ کر مجھے سر سید احمد خاں کی اعلیٰ کارکردگی کا اعتراف ہوگیا۔اس اسکول کے بانی و جنرل سکریٹری جناب محمد عمر شریف مظاہری کی قومی و ملی خدمات اظہر من الشّمس ہے۔اسکول کے لئے زمین کی فراہمی اسکی بنیاد گذاری میں انگلینڈ کے معزز شہری ظفر منیر شبلی اور عقیل احمد خاں کا قابل لحاظ مالی تعاون شامل رہا ہے۔اسکول کے اعلیٰ تعلیمی معیار اور عمدہ نظم و نسق اسکول کے پرنسپل کیپٹن محمد مقصود خاں کی انتھک کوششوں اور محنتوں کا نتیجہ ہے۔اس اسکول کا امتیاز یہ ہے کہ مسلم بچوں کے لئے اردو ایک لازمی سبجیکٹ ہے۔غیر مسلم بچے بھی ذوق وشوق سے اردو لکھتے اور پڑھتے ہیں۔کلاسوں کے معائنہ کے دوران درجہ پنجم کا ایک طالب علم ونود کمار کو اردو پڑھنے کے لئے کہا گیا تو اس نے بڑی روانی، صحیح تلفظ اور ادائیگی کے ساتھ اس نے ایک اقتباس کو پڑھ ڈالا۔دوسرے درجے میں بھی غیر مسلم طالب علموں نے اردو لکھ کر دکھایا۔اس اسکول کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ کلاس کے ہر کمرے کا رخ مغرب کی

جانب ہے۔نماز پڑھنے کے لئے لڑکے اور لڑکیوں کے لئے علحدہ علحدہ کمرے ہیں۔سوسائٹی کے پیش نظر منصوبوں میں گرلس اسکول کا قیام، نرسنگ ہوم، نورالہدیٰ سینیئر سکنڈری اسکول، فاطمہ سلائی کڑھائی سینٹر، انفارمیشن فیشن گائیڈنس سینٹر وغیرہ خاص ہیں۔

عقیل احمد خاں جنکا نورالہدیٰ ہائی اسکول کی بنیاد گذاری میں خاطر خواہ مالی تعاون شامل رہا ہے وہ بیک وقت اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر گہری دسترس رکھتے ہیں۔انکی شعر فہمی اور انگریزی زبان میں فنکارانہ ترسیل کا اندازہ انکے ذریعہ کئے گئے غلام مرتضٰی راہی کے شعروں کے انگریزی تراجم سے ہوتا ہے۔موصوف کے ترجمے اصل سے قریب تر ہوتے ہیں۔عقیل احمد خاں کانپور کے کرائسٹ چرچ کالج میں بی۔اے۔میں غلام مرتضٰی راہی کے ہم جماعت احباب میں رہے ہیں۔عقیل احمد خاں نے انگریزی میں ایم۔اے۔کیا ہے۔فکر معاش میں وہ کراچی، کانپور، بھوپال ہوتے ہوئے لندن پہنچ گئے۔برطانیہ کی شہریت حاصل کی اور پھر سعودی عرب کی حکومت کی طرف سے بحیثیت انگریزی معلم مدینہ منورہ اور پھر مکّہ معظّمہ میں تقرری ہوگئی۔عقیل احمد خاں کی مشہور سرگزشت ''یادوں کا سفر'' انکی حیات، کارنامے اور عرب ،ایران اور یوروپ کے اہم شہروں اور تاریخی مقامات کے تذکروں سے عبارت ہے۔عقیل احمد خاں کے ذریعہ غلام مرتضٰی راہی کے اشعار کے چند ترجمے پیش کئے جاتے ہیں جس سے راہی کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

تعمیر کے لئے مجھے درکار ایک عمر
تخریب کیلئے مجھے اک لمحہ چاہیئے

An age I require to build what I wish

But a moment I may take to cause havoc and

destruction.

کوئی بھی غم نہیں ایسا کہ جو نہ جاتا ہو
اک اور غم سے مجھے ہمکنار کرتے ہوئے

Not a grief do I know which passes away
without my inheriting a new one in its trail

رہی ہوا مری منزل ہر اک تعین سے
کہیں پہ ختم میں اپنا سفر نہ کر پایا

Every ideal has led me in persuit of another
The odyssey of my life has nowhere met its end

ہر ایک کام وقت کا مرہون ہوتا ہے
جب سرخ ہو سلاخ تبھی اسکو موڑیئے

Every action is timed for a moment opportune
Strike while the iron is hot as aptly said

ہزاروں سال سروں سے کہیں گذرنے پر
پرند سے ہمیں پرواز کا سراغ ملا

Hovering over our heads for thousands of years
The mystry of flying was revealed upon us from
birds

بہت خون اس میں بہا خواہشوں کا
لڑائی جو اک میں نے دل سے لڑی ہے

I know alone, how I bled on the altar of my

wishes

A pitched battle, I faught against my heart

اب غلام مرتضیٰ راہیؔ پھر سے فتحپور کے ہو گئے۔فتحپور کی ادبی سرگرمی بدستور جاری تھی۔ظفر اقبال ظفرؔ، برّصغیر میں پہچانے جا چکے تھے۔م۔اخلاق، اندر سروپ سری واستو،قمر صدیقی،سعید الظفر وسیم،الحاج جمال احمد، گوہر مسعود کی طرف اہل نظر کی توجہ مبذول ہو چکی تھی۔نعتیہ گویوں میں عرفان فتحپوری محتاج تعارف نہیں تھے۔غلام مرتضیٰ راہیؔ کے آنے سے ادبی سرگرمیوں میں تیزی آ گئی۔اندر سروپ سری واستو اور سعید الظفر وسیم نے غلام مرتضیٰ راہیؔ سے مشورہ سخن کرنا شروع کر دیا تھا۔فتحپور کی معتبر شخصیتوں میں ایک اہم نام ڈاکٹر اسماعیل آزاد کا ہے۔یہ ۲۰۰۲ء میں فتحپور کے مہاتما گاندھی پوسٹ گریجویٹ کالج سے بحیثیت ریڈر و صدر شعبہء اردو وظیفہ یاب ہوئے تھے۔صنف نعت پر ڈاکٹر اسماعیل آزاد کے حقیقی اور تنقیدی کاموں کے اعتراف میں انکو پاکستان نعت اکادمی کا بین الاقوامی حیثیت کا سلور جبلی ایورڈ حاصل ہو چکا ہے۔انکی نگرانی میں اب تک پانچ ریسرچ اسکالرز کو نعت پر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری تفویض ہو چکی ہے۔ڈاکٹر محمد اسماعیل آزاد غلام مرتضیٰ راہی کی شخصیت سے کافی متاثر رہے ہیں۔انہوں نے مجموعۂ کلام ''لاشعور'' (۲۰۰۶ء) میں راہیؔ کی شاعری کے حوالے سے رقم کیا ہے کہ ''دل میں کروٹ بدلتے ہوئے جذبات اور ذہن میں سر اُٹھاتے ہوئے خیالات کو موزوں و متناسب حروف اور الفاظ میں قید کر لینے کا جو ملکہ راہیؔ صاحب کو حاصل ہے وہ دنیائے شعر و ادب کے کم شعراء کے حصے میں آیا ہے''

فتح پور کی ایک ممتاز شخصیت کا اعتراف کئے بنا یہ باب ختم نہیں ہو سکتا۔انکا نام نامی محمد معین الدین ہے وہ شہر کے نامور قانوں داں ہیں۔قدرت نے انکو اعلیٰ درجے کی سخن فہمی اور گہری تنقیدی بصیرت بخشی ہے۔ان کا مطالعہ وسیع و عمیق ہے۔

انمیں ادب نوازی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔فتحپور کے دورے پر غلام مرتضیٰ راہیؔ موصوف سے ملوانے انکے دولت کدے پر لے گئے۔معین الدین نے عمدہ خاطر تواضع کی اور گھنٹوں ادب پر گفتگو فرماتے رہے موصوف نہ تو شاعر ہیں نہ ناقد اور نہ افسانہ نگار لیکن زبان پر قدرت رکھتے ہیں۔

فتحپور کی ایک اور ادبی شخصیت جس نے مجھے متاثر کیا وہ ہیں جناب قمر صدیقی۔ قمر صدیقی ایک نغز گو شاعر ہیں۔انکی غزلیں مقتدر رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔یہ بڑے مخلص ملنسار اور صاف گو انسان ہیں۔فتحپور کے دوروزہ قیام میں یہ ہمارے ساتھ ساتھ رہے۔

ظفر اقبال ظفرؔ فتحپور کا ایک اہم ادبی نام ہے۔ظفر اقبال اور ظفر اقبال ظفرؔ میں نام کی مماثلت سے امتیاز کرنے میں کبھی کبھی قاری کو مغالطہ ہوجاتا ہے۔ظفر اقبال ظفرؔ فتحپور کے خیلدار محلّہ میں مقیم ہیں۔غلام مرتضیٰ راہیؔ کے ہم عصر اور محبّ خاص ہیں۔ بیرون ممالک کے پرچوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔شعر گوئی کا اپنا لب ولہجہ ہے۔جب فتحپور سے دھنباد کیلئے میں رونق شہری کی معیّت میں لوٹ رہا تھا تو غلام مرتضیٰ راہیؔ کے ہمراہ ایڈوکیٹ محمّد معین الدین ،قمر صدیقی اور ظفر اقبال ظفرؔ فتحپور اسٹیشن تک آئے تھے اور ٹرین کے اوجھل ہوجانے تک اپنے ہاتھوں کو ہوا میں لہرا کر الوداع کہہ رہے تھے۔

غلام مرتضیٰ راہیؔ نے اپنی خودنوشت ''منظور ہے گذارش احوالِ واقعی'' جو قسط وار سہ ماہی 'رنگ' دھنباد میں شائع ہورہی تھی اسمیں انھوں نے شہر دھنباد کا ذکر انڈو پاک مشاعرے کے حوالے سے کیا ہے۔ یہ مشاعرہ آزادی کے پچاسویں سالگرہ کے موقع سے ہورہا تھا۔اسکے کنوینر سہ ماہی ''رنگ'' کے مدیر شان بھارتی تھے۔شان بھارتی سے غائبانہ رسم وراہ پہلے سے ہی تھی۔ شان بھارتی کے بلاوے پر راہیؔ دھنباد کے انڈو پاک مشاعرے میں شرکت کیلئے حاضر ہوگئے۔ جہاں شان بھارتی ،آمر صدیقی، شمس

الہدیٰ انصاری (علیگ) اور شہود عالم آفاقی سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔شان بھارتی نے مشاعرے کی کار میں راہی کو دھنباد سے جھریا تک کی سیر کرائی۔معروف ادبی شخصیتوں سے ملاقات کرائی۔آمر صدیقی 'رنگ' کے معاون مدیر تھے۔راہی انھیں ایک نغز گو شاعر کی حیثیت سے جانتے تھے۔لیکن سہ ماہی رنگ میں راہی کا تیسرا مجموعہ کلام ''حرفِ مکرّر'' پر ان کا موجز و مبسوط تبصرہ پڑھ کر انکی گہری تنقیدی بصیرت کے قائل ہو گئے۔''چراغ بولتے ہیں'' انکا پہلا اور آخری شعری مجموعہ ہے''۔شمس الہدیٰ انصاری (علیگ) افسانوی دنیا میں اپنی پہچان بنانے میں سرگرداں ہیں۔انکا ایک افسانوی مجموعہ ''اندھے آدمی کا سفر'' ۲۰۰۷ء میں منظرِ عام پر آیا ہے۔مشاعرے کے انتظام کار کی حیثیت سے پیش پیش تھے۔شہود عالم آفاقی رسالہ ''شہود'' کے بانی و مدیر اور کلکتہ کے مشہور و معروف شاعر تھے۔تحت اللفظ میں غزلیں پڑھ کر مشاعرہ لوٹنے کا ہنر جانتے تھے۔انکا ایک شعر؎

شہر میں ایک بھی بچہ نہیں رونے والا
دانے دانے کو ترستا ہے کھلونے والا

بہت مشہور ہوا تھا۔مشاعرے میں پاکستان سے قتیل شفائی شریک ہوئے تھے۔ہندوستان کے اہم شعراء میں مخمور سعیدی، ندا فاضلی، ملک زادہ منظور احمد، بیکل اتساہی، منور رانا، عین رشید، شہود عالم آفاقی اور مقامی شعراء میں رونق شہری، شان بھارتی، آمر صدیقی، نجم عثمانی اور سہیل فصیحی نے شرکت کی تھی۔مشاعرے کا انتظام ڈاکٹر منموہن سنگھ (ایس۔پی) کے اچانک تبادلے کے بعد ابھے کمار بیباک (ایس۔پی۔ریلوے) دیکھ رہے تھے۔ابھے کمار بیباک خود بھی اچھے اور سنجیدہ شاعر تھے مشاعرہ بخوبی انجام پذیر ہوا۔دوسرے دن ابھے کمار بیباک نے اپنے بنگلے میں خصوصی شعری نشست کا انعقاد کیا تھا۔قتیل شفائی غلام مرتضٰی راہی کو پرچوں میں توجہ

کے ساتھ پڑھتے تھے۔اسلئے ان کی غزلوں کو سنجیدگی سے سنتے رہے تھے۔

غلام مرتضٰی راہیؔ کو اپنے بھانجے کی برات کے سلسلے میں شاہ جہاں پور کا دورہ کرنا پڑا۔تب انھیں رشید حسن خان، ڈاکٹر ذکاءالدین شایاںؔ، اختر شاہجہاں پوری اور خالد علوی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ رشید حسن خان ایک شہرہ آفاق محقق تھے۔'' انتخاب کلام ناسخ'' انکی مشہور کتاب ہے۔ جسے انجمن ترقی اردو، پاکستان نے ۱۹۹۶ء میں شائع کی تھی۔ڈاکٹر ذکاءالدین شایاںؔ برِصغیر کے معروف وممتاز شاعراور ناقد تھے۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کی نگرانی میں ''اٹھارہویں صدی کی اردو فرہنگ'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ ترتیب دیا۔'ریگِ سیاہ' 'کشش' اور 'منظر بہ منظر' ان کے شعری مجموعے کا نام ہے۔راہیؔ کے اعزاز میں شاندار شعری نشستیں ہوئیں اور پھر یہ فتح پور آگئے۔

راجستھان اردو اکاڈمی کے زیر اہتمام ''اختر شیرانی۔فن اور شخصیت'' پر دوروزہ سیمینار شہر کوٹہ میں ۹ راور ۱۰ راکتوبر ۱۹۹۹ء میں منعقد ہوا۔ جسکے کنوینر عقیل شاداب تھے۔غلام مرتضٰی راہیؔ بھی مدعو کئے گئے تھے۔سیمینار میں شرکت کے لئے راجستھان اردو اکاڈمی کے چیر مین سیّد مدبّر علی زیدی سکریٹری معظم علی، بشر نواز، مخمور سعیدی، ڈاکٹر صادق، ڈاکٹر عتیق اللہ، شاہد ماہلی، شین ۔کاف۔نظام ارشد عبدالحمید، فاروق انجینئر اور احتشام اختر تشریف لا چکے تھے، راہیؔ کے فراخ کمرے میں بشر نواز پارٹنر تھے۔بشر نواز راہی صاحب کی غزلوں کو توجہ سے پڑھتے تھے اور انکے دلدادہ بھی تھے۔ انکے قیام وطعام کا انتظام کوٹہ کے تین ستارہ ہوٹل 'کنک' میں تھا۔بشر نواز سیمینار کے پہلے اجلاس میں راہیؔ نے اختر شیرانی حیات اور معاشقہ'' کے عنوان سے ایک پُر مغز مقالہ پڑھا جو شرکاء کو کافی پسند آیا۔اجلاس کے ختم ہونے پر بشر نواز پر جو شراب کا نشہ طاری ہوا تو رات بھر راہیؔ صاحب کی نیند ہی حرام ہوگئی۔

غلام مرتضٰی راہیؔ بڑے خلیق اور ملنسار آدمی ہیں۔ان پر جب کسی نے ظلم کے

پہاڑ توڑے تو حق اور صبر کا دامن تھام لیا اور فیصلہ اللہ کے ذمے چھوڑ دیا۔۱۹۸۵ء کے اواخر میں جب راہیؔ محلّہ سرائے رحمٰن میں رئیس پٹرول پمپ والے کے مکان میں کرایہ دار تھے تو ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا۔اس محلّہ میں اقبال نامی ایک خطرناک مافیا سرغنہ بھی رہا کرتا تھا۔محلے کے سارے لوگ اس سے ڈرتے تھے۔اس نے نوجوانوں کی ایک ٹولی بنا رکھی تھی۔یہ نوجوان اقبال کے لئے ہر کام کرتے تھے۔۱۹۸۶ء کے ماہ صیام کی ایک شب میں اقبال نے غلام مرتضٰی راہیؔ کو اپنے یہاں بلوایا۔وہاں دو جوان سردار پہلے سے بیٹھے تھے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال نے بتایا کہ ان کے پاس کچھ ویڈیو کیسٹ ہیں سورن مندر پر کی گئی فوجی کاروائی کے فلمائے گئے مناظر ہیں جنہیں دیکھنا ضروری ہے۔آپ اپنا رنگین .T.V اور .V.C.P ایک روز کیلئے دے دیں۔ کل واپس کر دیا جائیگا۔راہی صاحب نے .T.V اور .V.C.P دینے سے انکار کر دیا۔ان کے جواب پر اقبال خاموش رہا۔راہیؔ چپ چاپ وہاں سے اپنے گھر آ گئے۔اقبال اب روزانہ انکے گھر پر پتھروں کی بارش کروایا کرتا تھا۔اب تو نماز پڑھنا، افطار کرنا، آنگن میں اُٹھنا بیٹھنا دشوار ہو گیا تھا۔مجبوراً تھانے دار کو بلا لایا۔تھانیدار نے ادھر اُدھر رخ کر کے لوگوں کو ایسا کرنے سے خبردار کیا۔تھانیدار کے منع کرنے پر بھی ظالم اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا۔روزانہ اب انکے دروازے پر ایک کاغذ چسپاں ہوتا جس میں گالیاں اور بے ہودہ کلمات لکھے ہوتے۔جسے راہی بغیر پڑھے چاک کر دیتے۔جب صبر و برداشت کی حد ہو گئی تو راہیؔ نے بحالت نماز اللہ کے حضور رو رو کر اقبال کیلئے بددعائیں کیں۔ایک دن راہیؔ کو خبر ملی کہ اقبال کا خون ہو گیا ہے۔تب راہیؔ کو اطمینان نصیب ہوا۔اور وہ نوجوان جو بگڑ رہے تھے راہ راست پر آنے لگے۔لوگوں کے چہرے سے خوف و ہراس کی جھریاں ہٹنے لگی تھیں۔

ایام شباب میں اکثر عشق و معاشقہ اور جنون عشق میں گریباں چاک کرنے کا

واقعہ رونما ہوجاتا ہے۔ راہیؔ کے ساتھ بھی ایسا کچھ ہوا۔لیکن ہوش وخرد کی حد تک۔ جب راہیؔ شہر کانپور میں بی۔اے۔ میں زیر تعلیم تھے تو کانپور کے محلّہ طلاق میں مقیم انکے ایک رشتہ دار کے سامنے والے گھر کی ایک لڑکی سے راہیؔ کا عشق ہوگیا۔ دونوں ایک دوسرے کیلیئے جان چھڑکتے تھے۔لیکن لڑکی کی بڑی بہن جو کراچی میں تھی والدین کے ہجر کے غم میں گھُل رہی تھی اسکا لحاظ رکھتے ہوئے پورا خاندان پاکستان ہجرت کرگیا۔ اورانہیں بی۔اے۔ پاس کرکے کراچی آنے کو کہا۔ جب راہیؔ نے بی۔ اے۔ پاس کیا تو کراچی جانا محال تھا کیونکہ ان کے والدین پہلے ہی دو بیٹوں کے ناگہانی حادثے سے ٹوٹ چکے تھے۔

راہیؔ نے بھی معاشقہ کیا لیکن اپنے خاندان کی عزت وناموس کی مٹی پلید نہیں ہونے دی۔ یہ واقعہ ۱۹۵۹ء کا ہے جب راہی قطب مینار کی سیر کرنے پہنچے تھے۔ ابھی وہ دستور کے مطابق کسی ساتھی کے انتظار میں تھے کہ ایک انجان الھڑ اور قبول صورت لڑکی راہیؔ کو اپنا ساتھی بنا کر قطب مینار کی سیڑھیاں طے کرنے لگی۔ دوتین منزلیں طے کرنے کے بعد لڑکی کی سانسیں اُکھڑنے لگیں وہ سانسوں کے اُتار چڑھاؤ کو ٹھیک کرنے کی خاطر ایک سیڑھی پر بیٹھ گئی راہیؔ بھی ایک زینے پر بیٹھ گئے راہیؔ اس لڑکی میں دلچسپی لے رہے تھے اسکے حرکات وسکنات اسکے نشیب وفراز سے محظوظ ہورہے تھے کہ انہیں اچانک قطب مینار کے تقدس کا خیال آ گیا اور اس لڑکی کی پیشہ وارانہ پیش کش کو ٹھکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے لڑکی جب بضد ہوئی تو انہوں نے یہ کہہ کر اپنا پنڈ چھڑایا کہ یہ ایک ایسی مسجد کا مینار ہے جو شرمندۂ تعمیر نہ ہوسکی۔ یہاں سے پہلے اذان دی جاتی تھی اس لئے یہ مسلمانوں کے لئے بڑی پاک وصاف جگہ ہے اور چونکہ میں مسلمان ہوں اسلیئے اس کے تقدس کا احترام میرے لئے ضروری ہے۔ راہیؔ کے ادبی جمود کی ایک وجہ عشق کا ذہنی فتور بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایمرجنسی کے دوران میرٹھ کی ایک تعلیم

یافتہ باذوق شاعرہ نے ان سے قلمی رابطہ قائم کیا پھر یہ قلمی رابطہ میل جول میں تبدیل ہو گیا۔ موقع بموقع ملنے کی سبیل بھی نکل آئی جناب انکی غزلوں پر اصلاح بھی دینے لگی اور پھر انکی یادوں میں اس قدر محو ہو گئے کہ انہوں نے اپنی شاعری کا سارا زور ان سے ملنے جلنے اور انکی تخلیقات کو بنانے اور سنوارنے میں صرف کرنے لگے۔ اس سے انکو خاصہ نقصان پہنچا جب انہیں اس کا احساس ہوا تو اس طرف سے اپنا منہ پھیر لیا۔

غلام مرتضیٰ راہیؔ کی حیات میں ایک سلیقہ اور نظم وضبط شروع سے ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ عہد طفلی میں بچوں کے ہمراہ کھیلے کودے، طالب علمی کے زمانے میں خوب دلجمعی اور سنجیدگی سے پڑھے لکھے جب سن بلوغ کو پہنچے تو اپنی محنت شاقہ کی بدولت ۳۱ رمارچ ۱۹۶۲ء میں ملازمت حاصل کی، بعدِ ملازمت ۳۱ رمئی ۱۹۶۲ء کو شادی رچائی اور تب ۱۹۶۴ء سے باضابطہ طور پر شاعری کی شروعات کی یہ اور بات ہے کہ ۱۹۵۳ء سے ہی شعر موزوں کر لینے کا ہنر آ گیا تھا اور ۱۹۶۰ء میں چند نظمیں کہہ ڈالی تھی۔ لیکن کلی طور پر ذہن کو ساری مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد ہی ادب کی طرف رجوع کیا۔ انکے مزاج میں عجلت پسندی کبھی حائل نہیں ہوئی ایک ہی ساتھ کئی طرف ذہنی کشمکش سے کسی کام میں پائیداری نہیں آتی۔ اس قول پر انہوں نے ساری عمر اپنا کام کاج کیا ہے۔ انکی زندگی پر ان ہی کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

ترتیب سے حُسن ہے جہاں کا
اک چیز ادھر اُدھر نہیں ہے

ابھی تک کی تصانیف میں مجموعہ غزلیات کی تعداد کل چھ ہے۔

(۱) لامکاں (۲) لاریب (۳) حرفِ مکرّر (۴) لاکلام
(۵) سدابہار غزل (دیوناگری زبان میں) (۶) لاشعور

'لامکاں' ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۷۱ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس کا

انتخاب شمس الرحمٰن فاروقی نے کیا تھا۔اوراس مجموعے کا نام 'لامکاں' بھی انھیں کی تجویز کردہ ہے۔'لامکاں' ۱۱۲صفحات پر مشتمل ہے اس میں ۸۳غزلیں شامل ہیں۔اسے عابد سہیل ''مدیر ماہنامہ کتاب'' نے نصرت پبلیشرز لکھنؤ سے شائع کروایا تھا۔اس مجموعے پر انھیں اُتر پردیش اردو اکادمی کا انعام حاصل ہوا تھا۔اس مجموعے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں کسی کا دیباچہ، پیشِ لفظ،مقدمہ یا رائے شامل نہیں ہے۔ بلکہ اسے براہ راست پیش کیا گیا تھا۔ان میں خود اعتمادی اور پُر گوئی کے عناصر حد درجہ موجود تھے۔راہی اپنے اولین شعری مجموعہ سے ہی برصغیر کے مقتدر ناقدوں کی توجہ مبذول کرانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔'لامکاں' پر اردو کے نامور شعراء ادبا اور نقّاد کی آراء کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن کے مطابق

''اس شان کی غزل لکھنے والے اردو میں انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔اس مجموعہ سے ایک بار پھر غزل کے نئے امکانات کا ثبوت ملتا ہے''۔

شمس الرحمٰن فاروقی کے مطابق

''ان غزلوں میں ایک ایسا شخص نظر آتا ہے جو متفکّر، تھوڑے سے چلبلے، درّاک ، انانیت اور قوت سے بھر پور ذہن رکھتا ہے۔اس مجموعہ کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ شاعر کی شخصیت حقائق حیات سے مفاہمت کرنے کے بجائے ان سے ستیز کرتی نظر آتی ہے اور اس ستیز کا آہنگ انتہائی ذاتی ، انتہائی داخلی ، دروں بینی اور جگہ جگہ نوکدار استعاروں اور غیر متوقع تناظروں سے عبارت ہے۔تشکیک اس ستیز کا پہلا حربہ ہے جو عمومی مشاہدات کو ایک تیسرا بُعد بخش دیتا ہے۔تفکر اور تجسّس کی جو منزل غلام مرتضیٰ راہی کے اچھے شعروں میں نظر آتی ہے وہ خود ترحمی ، بے چارگی اور بے اثری سے بہت آگے ہے۔میرا خیال ہے کہ اسی طرح کے اشعار میں ان کے آئندہ

اور ذاتی اسلوب کی تلاش ممکن ہے''۔

ڈاکٹر شہریار کے مطابق

''مجموعی طور پر یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ غزل کی نزاکتوں اور بلاغتوں کا جتنا اور جیسا امتزاج راہیؔ کے یہاں ملتا ہے کم شاعروں کے یہاں نظر آتا ہے۔ انکی ہر غزل سنجیدگی اور ٹھہر ٹھہر کے مطالعے کا مطالبہ کرتی ہے اچھی اور سچی شاعری کی یہ بھی ایک پہچان ہے''۔

ڈاکٹر بشیر بدر کے مطابق

'' غلام مرتضٰی راہیؔ کی شاعری کا 'میں' ایک طرح سے جدید 'میں' کا زندہ اور متفکر کردار ہے۔ سچائی یہ ہے کہ اسکے اپنے احساسات اور تجربات ہیں اور شعری اظہار میں مخصوص الفاظ کیساتھ جس تخلیقی انداز سے غلام مرتضٰی راہیؔ تہہ داری اور نوکیلا پن پیدا کرتے ہیں، وہ قابلِ قدر ہے''۔

بانیؔ کی رائے

''میں تمہاری شاعری کو بے حد پسند کرتا ہوں۔ تمھارا انفرادی رنگ پورے مجموعے سے ظاہر ہے۔ ادھر تمہارے مجموعے پر تبصرے نظر سے گذرے۔ بہت سی خوبیوں کا انہوں نے ذکر نہیں کیا۔ تم کوئی معمولی غزل گو نہیں ہو۔ میں غزل کے میدان میں تمھیں سلطان اختر اور زیب غوری کو بہت اہم سمجھتا ہوں''۔

مخمور سعیدی کے مطابق

''غلام مرتضٰی راہیؔ ایک متجسّس ذہن کے شاعر ہیں۔ ایک ایسا متجسّس اور مضطرب ذہن جو زندگی کے اوپری رنگ وروپ سے گزر کر اس کی بدہیئتی سے بھی دوچار ہونے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ انکے ذہنی تجسّس کی نوعیت فلسفیانہ نہیں ہے۔ یہ تو ایک ایسے مضطرب ذہن کا تجسّس ہے۔ جو آس پاس کی ہر شئے کو شک بھری نظروں سے

دیکھنے کا خوگر ہو گیا ہے۔ اس تجسّس کی بنیاد ایک ایسے زندہ احساس پر ہے جسکی متموج لہریں شاعر کو آسودہ خاطری کے ساحل سے دور بہا لے گئی ہیں''۔

ڈاکٹر شمیم حنفی کے مطابق

''لامکاں'' کی غزلوں میں بھی انھیں تہذیبی مسائل، تجربوں اور افکار کی بازگشت ملتی ہے جو ہمارے عہد میں نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کی ہر زندہ زبان کے ادب کا مزاج بن چکے ہیں۔ راہی صاحب کا طرۂ امتیاز یہ ہیکہ وہ صاف ستھرے اور منظّم طریقے سے ان تجربات کا اظہار کا ہنر بھی رکھتے ہیں۔ زبان و بیان کے رموز سے وہ واقف ہی نہیں ان پر قادر بھی ہیں۔ چنانچہ لامکاں کی غزلوں میں جابجا ایسے اشعار ملتے ہیں جن کا بے ساختہ لہجہ اور نکیلا پن اچھی غزل کا مزاج رکھنے والوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

پرکاش فکری کی رائے

''میں صدق دل سے یہ مانتا ہوں کہ اس نقار خانے میں ان چند آوازوں میں سے ایک آواز آپ کی بھی ہے جسے میرے کان فوراً پہچان لیتے ہیں''۔

مصور سبزواری کے مطابق

''تحیّر تجسّس اور اعصابی خوف کی علامتوں سے لبریز جدید غزل کا ایک نام غلام مرتضیٰ راہی بھی ہے''۔

وارث علوی کی رائے

''میں نے آپ کی غزلوں کو دلچسپی سے پڑھا۔ آپ کے یہاں فکر اور اسلوب دونوں میں ایک قسم کی تازگی کا احساس ملتا ہے''۔

کرامت علی کرامت کی رائے

''آپ نے اردو ادب کو جو کچھ دیا ہے وہ آپکو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے''۔

ڈاکٹر عتیق اللہ کی رائے

''لامکاں'' آپ کے فن اور وہ بھی غزل کے فن کا پہلا کنکریٹ (Concrete) نمونہ ہے۔یہ مجموعہ غزل کے آرٹ،اسکی نفسیات نیز اس کی سائنس پر آپ کی گہری نظر کا پوری طرح مظہر ہے۔آپ نے ہر جگہ بڑے اعتماد اور چابکدستی سے اپنے Objects کو گرفت میں لیا ہے۔ایک طرف تو آپنے غزل کے دائرہ اختیار کو وسیع کر کے اسے Teto -a- Tete کی رسمی سرگوشیوں اور خود کلامیوں سے باہر لا کھڑا کیا ہے۔تو دوسری طرف آپ نے اپنے کو کسی دوسرے Obsorbent کی روشنائی نہیں بننے دیا''۔

ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی کے مطابق

''عرفان ذات اور خود یابی کا احساس و اظہار جس شدت اور انفرادیت کے ساتھ راہیؔ کے یہاں نظر آتا ہے جدید شعراء کے یہاں خال خال ہی ملتا ہے۔راہیؔ کی آواز ان کی منفرد آواز ہے ایسے زندہ رہنے والے محاسن کلام سے بھرپور اشعار کا مجموعہ 'لامکاں' دنیائے ادب کے نکتہ شناس و سخن فہم باشندوں،فن کے انصاف پسند اور صاحب الرائے ناقدوں اور جدید اردو شاعری کے رسیا حضرات سے جتنی بھی داد حاصل کرے وہ کم ہے''۔

ڈاکٹر سیفی پریمی کے مطابق

''لامکاں''،میں مشاہدات کی رنگینی،جذبات کی صداقت،خیال کی نزاکت اور فکر کی صحت مندی جھلکتی ہے۔شاعر کا لب ولہجہ منفرد اور پسندیدہ ہے۔داخلی کیفیات کا عنصر غالب ہے۔مگر سماجی شعور کی مثالیں بھی کمیاب نہیں۔عموماً غزلیں مترنم اور نقصِ بیان کے عیب سے پاک ہیں۔'لامکاں' کی ایک خوبی یہ ہے کہ عروض و بیان کے لحاظ سے اس پر حرف گیری کا اندیشہ بہت کم ہے۔یہ بات بے تامل کہی جاسکتی ہے کہ

جذبات تخیل اور انفرادیت راہی کے 'لامکاں' کی روح ہیں۔

کلام حیدری کے مطابق

''غزل اس قدر نازک آبگینہ ہے کہ ہر لمحہ ٹھیس لگنے کا خوف لگا رہتا ہے۔ راہی اپنی غزلوں میں اس آبگینے کو بے حد سلیقے اور احتیاط کے ساتھ سنبھالے ہوئے نظر آتے ہیں''۔

عقیل شاداب کی رائے

''رسائل میں سب سے پہلے آپ کا نام تلاش کرتا ہوں۔آپ کے یہاں جو سوچ کی نہج اور تجسّس ہے ساتھ ہی جو غزل کا نکھرا ہوا اسلوب ہے وہ نئے شاعروں میں کم کم نظر آتا ہے''۔

حسن نعیم کے مطابق

'' مطالعہ و مشاہدہ خوب سے خوب تر کی تلاش ایک کبھی نہ ختم ہونے والے سفر کا نام ہے۔ دل خوش ہوتا ہے۔ کہ راہی اس سفرِ مسلسل کے تقاضوں سے واقف ہیں۔انہوں نے بلا شبہ بہت اچھے اشعار بھی کہے ہیں''۔

فضا ابن فیضی کے مطابق

''لامکاں'' سے اندازہ ہوتاہیکہ راہی اپنے فنی خلوص کی پوری توانائی کیساتھ فکر کرتے ہیں۔انکے اشعار میں نئے تجربوں کی گرمی بھی ہے اور جدید فکری میلانات و عوامل کی روشنی بھی''۔

قمر احسن کے مطابق

''سب سے پہلے جب میں نے 'لامکاں' کا سرسری جائزہ لیا تو اسمیں سے ایک طلسم ہوشربا کی طرح مجھے ایک دھواں سے اٹھتا دکھائی دیا۔ جو لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جارہا تھا۔اور جیسے جیسے میں لامکاں کے صفحات الٹتا گیا مجھے لگا جیسے دھویں میں سے کسی

بڑے جادوگر کی شکل ابھر رہی ہے اور جب آخری صفحہ الٹ کر میں نے ایک لمبی سانس لی تو دیکھا کہ وہ شکل بالکل صاف ہو کر دور پر ٹھہری ہے اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہی ہیں غلام مرتضیٰ راہیؔ۔ راہیؔ اپنی شاعری کیساتھ ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ انکے سوچنے کا انداز بھی پختہ ہے پیش کرنے میں فن بھی ہے انفرادیت بھی۔

اعجاز عسکری کے مطابق

''غزل میں راہیؔ کا رشتہ اس مکتبہ سے ملتا ہے جسکی نمائندگی ''آبِ رواں'' والے ظفر اقبال کرتے ہیں لیکن اس یکسانیت سے جو مشترک زبان اور لب ولہجہ کی دین ہے یہ مطلب نہیں نکالنا چاہئے کہ راہیؔ کے یہاں نئی معنویت کی تلاش بے سود ہوگی۔ میرا اندازہ ہیکہ انھوں نے زبان کے استعاراتی استعمال میں پہلو دار معنویت کے کئی گُل کھلائے ہیں اور گمان ہوتا ہیکہ یہ آواز مانوس ہونے کے باوجود نئی ہے۔

احتشام اختر کے مطابق

''غیر جانبدار ہو کر اگر راہیؔ کے کلام پر ناقدانہ نگاہ ڈالی جائے تو یہ بات واضح طور پر سامنے آجاتی ہیکہ ان کے یہاں اپنی ذاتی آواز ضرور ہے جو دوسروں کی آوازوں میں پہچانی جاسکتی ہے''۔

ساحل احمد کے مطابق

''لامکاں' کی غزلیں پڑھنے کے بعد فنکار کی عظمت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ راہیؔ نے یکسر روایت سے بغاوت نہیں کی بلکہ انھوں نے داخلی کرب اور خارجیت کو صحتمند علامتوں سے نکھارنے کی کوشش کی ہے جس میں نیا پن کے ساتھ ساتھ شدّت جذبات کی والہانہ کیفیت ہے انھوں نے غزل کے سوچنے اور سمجھنے کے ڈھنگ میں کامیاب تجربے کئے ہیں جن کی وجہ سے ان کی غزلوں میں جدید اشارات، علامات، نئے موضوعات، انفرادی جذبات واحساسات کی شدید تر اجتماعی فکر کی قندیلیں روشن ہوئی ہیں''۔

ڈاکٹر مرزا خلیل کے مطابق

''غلام مرتضیٰ راہیؔ' کا شعری اسلوب نہ صرف یہ کہ صوتی اور لفظی سطح پر بلکہ نحوی سطح پر بھی ایک منفرد اسلوب ہے۔راہیؔ کے کلام کے لسانی تجزیہ سے زبان و بیان کی بے شمار خوبیاں ہمارے سامنے آتی ہیں۔''

پروفیسر اکبرالدین صدیقی کے مطابق

''صنف غزل عشق و عاشقی ، رنگ و بو،گل و بلبل اور چھیڑ چھاڑ کیلئے بدنام رہی ہے۔مولانا حالیؔ نے اسے برا سمجھا اور کلیم الدین احمد نے اس سے نفرت کا اظہار کیا لیکن اس ربع صدی میں ہمارے شعراء نے اس کو نیا آب و رنگ دیا۔نئی آن بان عطا کی اس صف میں غلام مرتضیٰ راہیؔ بھی ہیں۔ وہ اپنے موضوع ،انداز غزل گوئی اور اظہارِ خیال میں منفرد مقام کے حامل ہیں''۔

ڈاکٹر وہاب اشرفی کے مطابق

''لامکاں' کو اس نقطہء نظر سے پڑھنا چاہئے کہ اس سے ایک عظیم عمارت کی بنیاد پڑ گئی ہے''۔

حامدی کاشمیری کے مطابق

''واقعی آپ کا کلام منفرد نوعیت کا ہے۔ہجوم میں اپنی منفرد حیثیت کو قائم کرنا آپ کے تخلیقی ذہن کی غیر معمولی فعالیت کو ظاہر کرتا ہے۔'لامکاں' کی پورے ملک میں غیر متوقع پذیرائی ہوئی ہے۔ادبی حلقوں میں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔'لامکاں' کو جدید غزل کا شاہکار تسلیم کیا گیا۔ ہر خطے اور ہر مکتبہ فکر کے قلمکاروں نے اسے سراہا اور قدر کی نگاہ سے دیکھا۔''

'لامکاں' کے تعلق سے **زیب غوری** کا ایک خط جو ۱۰ر فروری ۱۹۷۲ء کو غلام مرتضیٰ راہیؔ کو ارسال کیا گیا تھا۔اس کی سطور یہ ہیں۔

''تمھاری صحت کیسی ہے؟ اپنی صحت کا خیال رکھو۔ ابھی بہتوں کا کباڑا کرنا ہے۔ لوگ دہشت میں اپنی اپنی کرسیوں کو مضبوط پکڑے بیٹھے ہیں اور مجھے ہنسی آتی ہے۔''

غلام مرتضیٰ راہی کا دوسرا شعری مجموعہ ''لاریب'' ۱۹۷۳ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ یہ مجموعہ خلیل الرحمٰن اعظمی کا انتخاب کردہ ہے یہ بھی 'لامکاں' کی طرح ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ۹۳ غزلیں شامل ہیں۔ اسے ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی نے دلنواز پبلیکیشنز بمبئی سے شائع کیا تھا۔ 'لاریب' بھی 'لامکاں' کی طرح پیش لفظ، دیباچہ یا تقریظ سے پاک ہے ہاں اسکے فلیپ پر پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی اور ڈاکٹر وحید اختر کی مندرجہ ذیل آراء درج تھیں۔

پروفیسر آل احمد سرور

''غلام مرتضیٰ راہی کے کلام میں ہمیں نئی حسیّت کی جلوہ گری ملتی ہے اور اس وجہ سے ان کی معنویت مسلّم ہے۔ ان کے مجموعے 'لامکاں' کا ادبی حلقوں میں خیر مقدم کیا گیا تھا۔ راہی نے اسکے بعد جو کچھ کہا اس میں تازگی اور نئے احساس کی کارفرمائی اور بھی نمایاں ہے۔ یہ غزلیں پرانے سرمائے سے انحراف نہیں کرتیں۔ ان میں پرخلوص تجربے کی روصرف بغاوت پر مائل نہیں ہے۔ انفرادی تجزیئے اور ذاتی احساس کو زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ اس ذاتی احساس سے وہ اس دور کے لہجے تک پہنچتے ہیں۔

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے مطابق

''غلام مرتضیٰ راہی ہماری توجہ کے مستحق ہیں۔ انھوں نے اپنے ذاتی تجربوں پر بھروسہ کیا ہے اور اسلوب کو اپنی فکر سے علیحدہ رکھنے کے بجائے انکے صحیح امتزاج پر نظر رکھی ہے راہی کی غزل میں ایک تہہ داری اور فکری دبازت ملتی ہے اور انکے لہجے کی تازگی ان کے تخلیقی عمل کا فطری نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ 'لامکاں' کے بعد 'لاریب' انکی انفرادیت اور انکے شعری کردار کو مستحکم کرتا ہے۔

ڈاکٹر وحید اختر کے مطابق

''ہندوستان میں غزل کے جدید لہجے اور محاورے کو تخلیقی بصیرت کے ساتھ موضوعی تجربے کی اساس پر مستحکم کرنے والے شعراء میں غلام مرتضیٰ راہی کا نام بھی لیا جاتا ہے۔۔۔۔جدید شاعری نئے معانی کی تلاش ہی نہیں تخلیق بھی ہے۔'لاریب' اس تلاش و تخلیق کی ایک روشن مثال ہے''۔

'لاریب' کو'لامکاں' کی اگلی منزل قرار دیا گیا تھا۔اس حوالے سے چند معتبر قلمکاروں کے رشحات قلم کے اقتباس پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ شعری مجموعہ اپنے اندر گونا گوں خصوصیات رکھتا ہے موضوعات اور کیفیات کے تنوع کے ساتھ ساتھ اس میں اسلوب اور آہنگ کے بھی بعض نئے اور انوکھے تجربے ملتے ہیں'۔

ڈاکٹر شہریار کے مطابق

'' میں اس مجموعے کا خیر مقدم کرتا ہوں کہ ہر اعتبار سے یہ اچھی اور سچی شاعری کا ایک شاندار انتخاب ہے'۔

بانی کی رائے

''غزل کے تمام مجموعوں میں 'لاریب' بہترین ہے۔تم جانتے ہو کہ میں تمھاری غزل کا عاشق ہوں''۔

وارث علوی کی رائے

'' میں آپ کو اس دور کا اہم شاعر تسلیم کرتا ہوں اور آپکے ذہین اور دانشور مداحوں میں خود کو شامل کرنا باعثِ فخر سمجھتا ہوں''۔

مظہر امام کی رائے

''گزشتہ ٦ چھ سال میں نمایاں ہونے والے غزل گوشاعروں میں سب سے زیادہ آپ کو اور مصور سبز واری کو پسند کرتا ہوں''

ڈاکٹر مظفر حنفی کی رائے

''بے شک تم نے 'لامکاں' سے 'لاریب' تک کا سفر بڑی تیز رفتاری اور کامیابی کے ساتھ طے کیا ہے۔'لامکاں' کی خوبیوں کے نقوش تازہ مجموعے میں گہرے ہو گئے ہیں اور موضوعات کا تنوع بڑھ گیا ہے۔''

مصور سبز واری کی رائے

''لہجے کی شاعری سودا سے شروع ہو کر یاس یگانہ چنگیزی، تلخ، اور باقی سے ہوتی ہوئی تمہارے یہاں تک پہنچی ہے۔مگر ان لوگوں کا لہجہ مجموعی طور پر غیر جاذب اور غیر شاعرانہ ہے۔تم نے غزل میں غزل کے ہی خوبصورت لہجے میں زندگی کے بے رحم اور کرخت مناظر کو ہم سب کے سامنے رکھا ہے۔جو کھردری صداقت سے بالکل الگ ایک نیا اور بڑا ہی خوبصورت انداز ہے۔''

سلطان اختر کی رائے

''آپ کی غزلیں مجھے برابر متاثر کرتی ہیں۔ ہندوستان کے غزل گویوں میں کم بہت کم لوگ مجھے پسند ہیں جن میں آپ کا نام میں بار بار لیتا ہوں''۔

ڈاکٹر اصغر عباس کے مطابق

''لاریب''ایک ایسے شاعر کی تخلیق ہے جو اپنی تہذیب اور غزل کی روایت کا بھرپور احساس رکھتا ہے۔راہی صاحب کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے اردو غزل کی علامتوں اور تشبیہوں کو اپنے اور آج کے بنیادی احساسات سے نئی شکل اور قوت عطا کی ہے۔یہ علامتیں اور تشبیہیں طلسمات ورنگ کی ایک دنیا بن گئی ہیں اور اسی لئے آج کے شعراء کی صف میں انہیں ممتاز حیثیت حاصل ہے''

ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر کے مطابق

'لاریب' کا غلام مرتضیٰ راہی ایک انفرادی اور باوقار شخصیت کا حامل نظر آتا

ہے جگہ جگہ اشعار کی گرفت نہایت مضبوط ہے۔اشعار دل میں اترتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔''

ڈاکٹر محمد مثنیٰ کے مطابق

''جدید غزل کے اس نمائندہ مجموعہ میں پرانے رموز و علائم میں نئی معنویت کے ساتھ نئے رموز و علائم اور جدید طرز کا استعمال نہایت سلیقہ کے ساتھ ملتا ہے۔''

جیسا کے میں نے سطور اولین میں اس کا ذکر کیا ہے کہ غلام مرتضٰی راہی پر پندرہ برسوں تک ادبی جمود چھایا رہا جسکی وجوہات بھی درج کی گئی ہیں اس اثناء میں لوگ غلام مرتضٰی راہی کو تقریباً فراموش کر چکے تھے۔''نظر سے دور تو دل سے دور'' والا مقولہ ان پر صادق آ گیا تھا۔لوگوں کے ذہن و دل پرانے وقت کے غبار کو ہٹانے کی خاطر راہی نے اپنے شعری مجموعے ''لامکاں'' اور ''لاریب'' کی منتخب غزلوں کو ترمیم، تخفیف اور اضافہ کے ساتھ مشترکہ ایڈیشن ''حرف مکرر'' کے نام سے فروری ۱۹۹۷ء میں شائع کیا۔ادبی حلقے میں اسکی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔اسکی ضخامت ۱۶۰ صفحات ہیں۔پہلا شعری مجموعہ ''لامکاں'' اور دوسرا شعری مجموعہ ''لاریب'' کی منتخب غزلوں کی بنیاد پر حرف مکرر کو دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔پہلے حصے میں ۶۸ اور دوسرے حصے میں ۶۷ غزلیں ہیں۔یہ کتاب خلیل الرحمٰن اعظمی، بانی اور زیب غوری کے نام انتساب ہے۔اس مجموعے کے منظر عام پر آنے تک یہ تینوں داغِ مفارقت دے کر دنیائے فانی سے کوچ کر چکے تھے۔اسکی ترتیب ناظر صدیقی نے دی تھی۔نئی نسلوں اور خصوصاً جدید ذہن و فکر رکھنے والے ادباء شعراء نے اس مجموعے کا خیر مقدم کیا۔چند آراء بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں۔

مظہر امام کے مطابق

''حرف مکرر کے بغیر جدید غزل کا مطالعہ ادھورا رہے گا''

ڈاکٹر احمر لاری کے مطابق

''راہیؔ ایک جینوین شاعر ہیں۔انکے اشعار ایک مدّت تک پڑھنے والوں کو مسرت اور بصیرت فراہم کرتے رہیں گے۔''

پروفیسر انیس اشفاق کی رائے

''آپ کی شاعری کا میں شروع سے قائل ہوں حرف مکرر کا مجموعی مطالعہ پڑھنے والوں پر ایک نیا تاثر قائم کریگا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے حرف مکرر کی بازخوانی نے میرے اس یقین کو پختہ کردیا ہے۔''

ڈاکٹر ابو محمد سحر کے مطابق

''حرف مکرر میں آج بھی بے تکان قسم کی انفرادیت ہے شاعری میں یہ خوبی کسی شعوری کوشش سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ فطری صلاحیت کا کرشمہ ہوتی ہے۔''

پرکاش فکری کے مطابق

''حرف مکرر میں جس راہیؔ سے میں مل رہا ہوں لگتا ہے یہ تو میرے لئے بالکل نیا ہے۔اس میں تیس پینتیس گزرے سالوں کی گرد کہیں نظر نہیں آتی۔ یہ مجموعہ میرے اس قول کی ہر صورت سے تصدیق کرتا ہے کہ'' کچھ ایسے پھول ہیں جنکی مہک نہیں جاتی۔''

شاہد ماہلی کی رائے

میں آپ کی شاعری کا پُرانا مدّاح ہوں۔ آپ کی غزلیں دل سے بہت قریب ہیں۔ جدید اردو غزل کے آپ جیسے چند شعراء ہی رہ گئے جو غزل کے فن کو پوری طرح نبھا رہے ہیں، ورنہ اب تو غزل گوئی کرتب بازی ہو کر رہ گئی ہے۔

شکیل گوالیاری کے مطابق

'حرف مکرر' کے مطالعے سے یہ اندازہ بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے کہ غلام مرتضیٰ

راہی اپنی ان غزلوں کے عہد تخلیق میں بہ اعتبار ندرتِ بیان، اور تازگیٔ افکار، اپنے وقت سے رُبع صدی آ گے تھے۔غزل کو اس کے فطری حسن و جمال اور خدوخال کے ساتھ فکرِ جدید کے آئینے میں دیکھنا ہو تو 'حرفِ مکرر' کا مطالعہ ضروری ہے۔

شاہد جمیل کے مطابق

'حرفِ مکرر' غلام مرتضٰی راہی کے تخلیقی رویّہ، تخیّل کی تہہ داری، افکار کے تنوّع، لہجے کے اُتار چڑھاؤ، نیز علائم واستعارات کے رچاؤ کے تعلق سے اپنا اعتبار قائم کرنے میں پوری طرح کامیاب ہے۔نئی غزل میں جن شعرا نے جدید لب ولہجہ کو اعتبار اور وقار سے سرفراز کیا ان میں غلام مرتضٰی راہی کا نام بے حد چست فہرست میں بھی جگہ پانے کی اہلیت رکھتا ہے۔

حرف مکرر پر غلام مرتضٰی راہی کو ۱۹۹۷ء میں اردو زبان وادب کی خدمات کے اعتراف میں آل انڈیا میر اکادمی، لکھنؤ کا امتیاز میر ایوارڈ عطا کیا گیا اور ۱۹۹۸ء میں صوبہ بہار کی ساہتیہ کارسنسد نے شاد عظیم آبادی کے ایوارڈ سے نوازا۔

حرف مکرر کے حوالے سے عشرت ظفر نے غلام مرتضٰی راہی کو ''عندلیب گلشنِ ناآفریدہ'' سے تعبیر کیا۔علی گڑھ کے مشہور ومعروف شاعر رئیس الدین رئیس نے حرف مکرر کی چند جلدیں بیرون ملک بھیجیں جن کے وسیلے سے امریکہ کے مامون ایمن اور صفوت علی صفوت سے غلام مرتضٰی راہی متعارف ہوئے اور پھر قلمی دوستی ہوئی۔حرف مکرر پر مدیر سہ ماہی لبرٹی (جو کہ انگلینڈ کے کارڈف سے شائع ہوتا تھا) انور شیخ کا تبصرہ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۷ء کے شمارے میں شامل تھا۔جس میں درج تھا کہ

''حرف مکرر ان تمام منازل کو طے کر چکا ہے۔جو کسی شاعر کو میدانِ شعری میں لا کر اسے شہسوار کے خطاب سے نوازتی ہے۔حرف مکرر کو سرسری انداز میں پڑھنا بے ذوقی کی دلیل ہے۔اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے گہرے مطالعہ کی ضرورت

ہے۔راہیؔ کا انداز بیاں منفرد ہے۔اس میں بے ساختگی اور نوکیلا پن ہے۔''

راہیؔ، انور شیخ سے پہلی بار متعارف ہوئے تھے۔انور شیخ کے اس تبصرے کے احسان کا بدلہ انہوں نے انکے دوشعری مجموعے 'نبض جہاں' اور 'سوز وساز' پر مضمون لکھ کرادا کردیئے تھے۔انور شیخ کو راہیؔ کا مضمون بہت پسند آیا تھا انہوں نے اس مضمون کا اقتباس اپنی کتاب کے فلیپ پر بھی آویزاں کیئے۔اور ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی مرتبہ کتاب ''انور شیخ بحیثیت شاعر'' میں بھی شامل کیا۔۔۔۔انور شیخ کے اقبال مخالف اور ملحدانہ طور طریقہ سے راہی بہت دکھی ہوئے اور پھر اپنی طرف سے ہاتھ کھینچ لیا۔

'لا کلام' غلام مرتضیٰ راہیؔ کا چوتھا شعری مجموعہ ہے۔ جو ۲۰۰۰ء میں منظر عام پر آیا۔ اس میں ۱۸۴ صفحات پر مشتمل مجموعوں میں کل ۱۱۶ غزلیں شامل ہیں۔ انتخاب شہریار کا اور ترتیب عقیل شاداب کی ہے۔اس کے فلیپ پر پروفیسر شمیم حنفی کی طویل رائے ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے پیش لفظ تحریر کیا ہے۔ یہ مجموعہ راہی کے مخلص دوست اور ممتاز شاعر وادیب صفوتؔ علی صفوتؔ کے مالی اشتراک سے شائع ہوا ہے۔صفوتؔ امریکہ کے معزز شہری اور نیو یارک کے مشہور اخبار اردو ٹائمز کے کالم نگار اور واشنگٹن پریس کلب اور پوئیٹری سوسائیٹی آف امریکہ کے فعال رکن ہیں۔ صفوت مثنویٔ وقت، مثنویٔ رسول، سوادِ حور اور انگریزی میں ٹائمبک (Tiambic) کے خالق ہیں۔

لا کلام کے حوالے سے مقتدر شعراء وادباء کی آراء پیش کی جاتی ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی کے مطابق

''راہیؔ کی نئی غزلوں میں آہنگ کا تنوع گزشتہ مجموعوں سے زیادہ ہے۔ایسی عمر میں جب اکثر شاعر تھک کر بیٹھ چکے ہوتے ہیں۔غلام مرتضیٰ راہیؔ نئے مرحلے تسخیر کررہے ہیں۔''

عاصم شہنواز شبلی کے مطابق

''اس میں وہی تیور، وہی تنوع، وہی متانت اور وہی تازگی نظر آئی جو راہیؔ کی شاعری کا خاصہ ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اس میں اسلوب اور معنی کے نئے اور مختلف العباد (Dimension) نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر علیم اللہ کے مطابق

''اب تک شاعروں کی جو دو نئی کھیپ سامنے آئی ہے، اس نے راہیؔ کے کلام کے مطالعہ سے لفظوں کو برتنے کا اہتمام سیکھا ہے، نئے مضامین کو جزوِ سخن بنانے کا ہنر جان لیا ہے اور روایت کے حسن کو سمجھ کر اس سے انحراف کرتے ہوئے اظہار کے نئے گوشے پیدا کرنے کا علم حاصل کیا ہے۔

ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی کے مطابق

''لا کلام'' میں کم وبیش ہر شعر قدرِ اوّل سے تعلق رکھتا ہے۔

ڈاکٹر سید امین اشرف کے مطابق

ایک تربیت یافتہ شعور مشاہدات و تجربات کی سنگینی و سنجیدگی کو محسوس کر سکتا ہے۔ لیکن اگر ترسیل وابلاغ کے فن سے ناآشنا ہے تو تجربہ اور احساس کی شدت اس کی ذات میں گھٹ کر اور سمٹ کر رہ جاتی ہے، لیکن جب یہ احساس ایک باکمال شاعر کی فنکارانہ ہنرمندی سے الفاظ میں ڈھلتا ہے تو غلام مرتضٰی راہیؔ کی شاعری بن جاتا ہے۔

ڈاکٹر رونق شہری کی رائے

'لا مکاں' سے 'لا کلام' تک کا سفر غلام مرتضٰی راہیؔ کا ایک مسلسل ذہنی ارتقا کا حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بانیؔ کے بعد اردو غزل میں فردیت اور شخصی مطالعہ کے باب میں راہیؔ بمشکل حیثیتِ ثانی قرار دیے جا سکتے ہیں۔

کرشن کمار طور کے مطابق

غلام مرتضیٰ راہی کے ہاں اپنے قرب و جوار کے مظاہر، واقعات اور حالات سے شعر اخذ کرنے کی جو غیر معمولی قوتِ متخیلہ موجود ہے، وہ انھیں اپنے ہم عصر شعرا میں ایک ممتاز فوقیت عطا کرتی ہے۔ یہ کشف عصری وسیلے سے ہی ان کے ہاں موجود ہو پایا ہے۔ راہی کا عصری کرب بے حد لطیف اور نازک احساسات کا آئینہ دار ہے۔

ڈاکٹر سراج اجملی کی رائے

ترقی کی مختلف صورتوں کا سامنا کرتے ہوئے ''شد پریشاں خواب من در کثرت تعبیر ہا'' والی صورت کو نہ صرف محسوس کرنا بلکہ اس کا تخلیقی اظہار ہمیں بے حد خوبصورت پیرائے میں اپنے عہد کے جس تخلیق کار کے یہاں نظر آتا ہے، اس کا نام غلام مرتضیٰ راہی ہے۔

عقیل شاداب کی رائے

''تمہارے جیسا شعر کہنے والے آج کے دور میں کمیاب ہی نہیں نایاب ہیں''

شکیل گوالیاری کے مطابق

''بلا شبہ اس مجموعے کی شاعری اکیسویں صدی کی فکر کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔''

ابراہیم اشک کے مطابق

''لاکلام'' غزل کی شاعری میں اضافہ ہی نہیں بلکہ ایک ایسا تحفہ ہے جسے ہر ہوش مند سنبھال کر رکھے گا۔''

ڈاکٹر انیس اشفاق کے مطابق

''لاکلام میں راہی صاحب کا قلم محسوسات کی انوکھی منزلیں تسخیر کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔''

قمر سنبھلی کے مطابق

''غلام مرتضیٰ راہیؔ کے یہاں فکر کی تازگی، فن کی پختگی اور لہجے کی انفرادیت ان کے وسیع مطالعہ اور عمیق مشاہدہ کی دین ہے۔''

پروفیسر شمیم حنفی کے مطابق

''مجھے انکے شعروں میں جو بات اچھی لگی وہ یہ تھی کہ تخلیقی واردات کے کامراں لمحوں میں انکا شعور رچا ہوا، انکی حسیّت اپنے عہد سے مشروط، انکا لہجہ منفرد اور انکی زبان تربیت یافتہ دکھائی دیتی تھی۔

پروفیسر لطف الرحمٰن کے مطابق

'لاکلام' کا شاعر اپنی بیکراں تخلیقی ذہانت اور لہجے کی پختگی اور تازہ کاری کی روشنی میں نہ صرف یہ کہ بے حد نمایاں اور ممتاز نظر آتا ہے بلکہ غزل کی عظیم الشان تخلیقی روایت کا ایک لازوال سنگِ میل بن چکا ہے۔

مظہر امام کے مطابقؒ

''غلام مرتضیٰ راہیؔ کی شاعری کا میں تیس سال سے قائل ہوں۔ان کی غزلوں میں اب بھی وہی آب وتاب ہے اور کہیں سے تھکن کے آثار نہیں ہیں۔تازہ دمی کی ایسی مثال ان کے ہم عصروں میں شاید ہی کسی کے یہاں مل سکے۔'لاکلام' کی غزلیں آج کی شاعری کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔

پروفیسر شارب ردولوی کی رائے

غلام مرتضیٰ راہی عہدِ جدید کے اہم شعراء میں ہیں۔ان کا ذہنی وفکری ارتقاء اردو میں جدیدیت کے رجحان کے سایے میں ہوا، اسی لیے ان کے یہاں فکر واظہار کے نئے تجربات کے ساتھ علامتوں اور محاوروں کے استعمال میں وسعت نظر آتی ہے۔'لاکلام' میں قاری، شاعر کے تجربات اور احساسات کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور

اکثر مقامات پر وہ خود شاعر کے تجربوں میں شریک ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر جمال اویسی کا تاثر

راہی صاحب زندگی کو روز مرّہ کی عام سطحوں پر نہیں دیکھتے۔ وہ حیات و کائنات کا ارتقا اور زوال دونوں کو مجموعی طور پر دیکھتے ہیں اور روحانی کشف کی منزلوں سے گزرتے ہیں۔ زندگی کے نشیب وفراز پر ان کی نظر بہت گہری پڑتی ہے۔

'سدا بہار غزل' غلام مرتضٰی راہی کا پانچواں شعری مجموعہ ہے جو انہوں نے ازخود ہندی زبان میں ترتیب دیا ہے یہ ۲۰۰۳ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ مجموعہ صفوت علی صفوت کے نام انتساب ہے۔ شکیل گوالیاری اور ڈاکٹر اوم پربھاکر نے اسکا انتخاب کیا ہے۔ اس کا پیش لفظ ڈاکٹر اوم پرکاش اوستھی صدر شعبۂ ہندی، مہاتما گاندھی پی.جی کالج، فتحپور نے تحریر کیا ہے۔ فلیپ پر ڈاکٹر سید مہدی جعفری کی رائے درج ہے۔ یہ مجموعہ ۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں ۹۱ غزلیں اور ۲۴ متفرق اشعار ہیں۔ دراصل یہ مجموعہ اس سے قبل منظر عام پر آنے والے مجموعوں کی منتخب غزلیات اور انکے متفرق اشعار پر مبنی ہے۔ اس شعری مجموعے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اردو کے ثقیل الفاظ کے معنی سہل زبان میں صفحہ کے اخیر میں درج کر دئے گئے ہیں۔ سید مہدی جعفری رقمطراز ہیں کہ ''راہی صاحب کی تیز نظر اور شعری لیاقت اس کیل پر بھی ٹک سکتی ہے جس پر محبوب کی تصویر ٹنگی ہو۔

آتا تھا جس کو دیکھ کے تصویر کا خیال
اب تو وہ کیل بھی مری دیوار میں نہیں

اوم پرکاش اوستھی کے مطابق

''راہی کی غزلوں میں روحانیت بھی ہے۔ اور دہریت بھی، ان میں قدیم فلسفہ بھی ہے تو جدید تہذیب بھی، روایت ہے تو جدیدیت بھی، تاریخ ہے تو سیاست

بھی۔ دو غیر متوازن کو توازن بخشنے کا نام ہے سدا بہار غزل۔

'سدا بہار غزل' کی اشاعت کا خاص مقصد ہندی ادب میں بھی غلام مرتضیٰ راہی کا متعارف ہونا تھا۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ انکی جو پذیرائی اردو ادب میں ہوئی ہندی زبان میں نہ ہو سکی۔

غلام مرتضیٰ راہی کا چھٹا شعری مجموعہ 'لاشعور' کے نام سے ۲۰۰۶ء میں منظر عام پر آیا۔ اسکی ضخامت ۱۵۲ صفحات پر محیط ہے اس میں ۸۴ غزلیں شامل ہیں۔ اس مجموعہ کو بھی راہی نے صفوت علی صفوت کے نام انتخاب کیا ہے۔ ترتیب و تزئین میں انکی اہلیہ رئیس فاطمہ راہی کا نام درج ہے۔ اردو ادب کے مایہ ناز اور مقتدر قلم کاروں کی آراء سے دونوں طرف کے فلیپ سجے ہوئے ہیں۔ ان معتبر شعراء و ادبا کے اسماء گرامی اسطرح ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن، شمس الرحمٰن فاروقی، مظہر امام، ڈاکٹر وارث علوی، ڈاکٹر شمیم حنفی، عشرت ظفر، ڈاکٹر کرامت علی کرامت، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، ڈاکٹر علیم اللہ حالی اور ڈاکٹر عتیق اللہ۔ کتاب کی پشت پر ڈاکٹر اسماعیل آزاد کا غلام مرتضیٰ راہی کی شخصیت کا تعارف مختصراً درج ہے۔ 'لاشعور' ادبی دنیا میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اس مجموعہ کی دنیائے شعر و ادب میں کافی پذیرائی ہوئی اور احترام کی نظر سے دیکھا گیا، ماہرین ادب نے اپنے اپنے طور سے اس پر مضامین اور تبصرے لکھے۔ چند کی آراء درج کی جاتی ہے۔

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کی رائے

غلام مرتضیٰ راہی، ہم عصر شاعروں میں اپنے منفرد اسلوب سے فوراً ہی پہچان لیے جاتے ہیں۔ شاعر صاحبِ بصیرت ہو اور اپنا منفرد دلکشن رکھتا ہو تو نہایت گہرے عمدہ جمالیاتی تجربے سامنے آتے ہیں۔ راہی کی غزلیں زندگی کی اس طرح تشریح کرتی ہیں کہ قاری کے ذہن کی الجھنوں سے قریب تر ہو کر سکون بخشتی ہیں، جمالیاتی آسودگی عطا کرتی ہیں، قاری کو محسوس ہوتا ہے جیسے اس کے سامنے کوئی نیا دریچہ کھلا ہے۔

علامہ شبلی کے مطابق

غلام مرتضیٰ راہی عہد حاضر کے ایک اہم اور باکمال شاعر ہیں۔ وہ غزل کے بے مثال نبض شناس ہیں، غزل کی روایت پر ان کی گہری نگاہ ہے۔ انھیں اس کا ادراک ہے کہ غزل ایجاز و اختصار کا فن ہے اور رمزیت اور اشاریت اس کی روح ہے، برہنہ گفتاری سے اس کا حسن مجروح ہوتا ہے۔ یہاں محض لفظ آرائی اور قافیہ پیمائی سے کام نہیں چلتا بلکہ رگ و پے سے لہو کشید کر کے شعری تخلیق کی شریانوں میں دوڑانا پڑتا ہے، تب جا کر معنی آفرینی کی متاعِ بے بہا ہاتھ آتی ہے اور اس میں انفرادیت اور استحکام پیدا ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں میں وہ جمالِ فن اور کمالِ ہنر ہے جو ان کے معاصر شعرا میں کم یاب ہے۔ ان کی غزلیں، شاعروں کی بھیڑ میں ان کی انفرادیت کی شناخت ہیں اور ہماری شاعری میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

صفوت علی صفوت کی رائے

اگر شعر میں گہرائی ہے تو ایک کہانی بسی ہوئی ہے، ایک سمندر کوزے میں بند ہے۔ ہمیں غلام مرتضیٰ راہی کے اشعار میں یہی کہانی پن نظر آتا ہے، یہی گہرائی ہماری بینش کا امتحان لیتی ہے۔ الفاظ کا یہی چناؤ ہمارے ذہن میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ ایک عام سے شاعر اور بڑے شاعر میں یہی پہچان ہے۔

ناوک حمزہ پوری کے مطابق

حضرت میر تقی میرؔ، بقول کے اپنے صرف بہتر شعروں کی بدولت ''خدائے سخن'' کہلائے۔ حضرت راہی کے کلام میں تو نشتر ہی نشتر بھرے پڑے ہیں، مشکل یہ ہے کہ خدا کے بعد تو کوئی ہے ہی نہیں۔ ایسے میں راہی کو کیا کہوں؟

عشرت ظفر کے مطابق

یہ غالب کی خیال بندی کا ہی کمال ہے جس نے بیسویں صدی میں غلام

مرتضٰی راہی جیسے شاعر کو جنم دیا۔

عنبر بہرائچی کی رائے

غلام مرتضٰی راہی کی کامیابی کی روشن دلیل یہ بھی ہے کہ ان کے زیادہ تر اشعار پیچیدگی کے ساتھ تاثیر اور کیفیت سے آمیز ہیں۔ یہ وہ منزل ہے جسے عظیم عالم، آنند وردھن نے رَس دھونِ (रस ध्वनि) کا نام دیا تھا یا غالب نے جسے 'گنجینۂ معانی کا طلسم' کہا تھا۔

ڈاکٹر اسماعیل آزاد کی رائے

انفرادیت اور ندرتِ اظہار میر، غالب اور اقبال کے یہاں بھی ہے، لیکن راہی صاحب کی انفرادیت متذکرہ بالا ابطالِ شعر و سخن سے الگ لب و لہجہ کی حامل ہے، اس لیے ان کے یہاں طرحداری، تہہ داری اور معنویت بالکل نئے خدوخال لیے ہوئے ہے۔

ابراہیم اشک کے مطابق

''علم و ادب کی دنیا میں ان کا یہ گرانقدر سرمایہ ہے۔ ان کی تازہ غزلیں رواں دواں ہیں اور شعری عظمتوں کو چھو رہی ہیں۔

عبدالاحد ساز کے مطابق

''اس میں دو رائے نہیں کہ 'لاشعور' سالِ رواں کی ایک بہت اہم شعری سوغات ہے جو ہم عصر اردو غزل کے نئے امکانی زاویوں کا اشاریہ فراہم کرتی ہے جسے غلام مرتضٰی راہی نے اہل ادب کے سامنے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

شکیل گوالیاری کے مطابق

''لاشعور'' کا شاعر تخلیقی اعتبار سے گزرے ہوئے ہر اس رویے سے بچ کر گزر جاتا ہے جو غزل کے کسی عمومی طرز فکر یا اسلوب بیاں سے وابستہ ہو کر شاعر کو اپنی

الگ شناخت سے محروم کر دیتا ہے۔ راہیؔ نے ایک بار پھر اپنی طبع رواں کے جوہر دکھائے ہیں اس خوبی اور پختگیٔ فن کے ساتھ کہ کہیں بھی اپنے آپ کو دہرایا نہیں۔

ڈاکٹر محبوب راہیؔ کے مطابق

'لاشعور' میں شعور وادراک اور علم وحکمت کے ایسے ایسے بیش بہا مرقع موجود ہیں جو دنیائے علم وشعور میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔

ڈاکٹر فراز حامدی کے مطابق

''لاشعور' میں ان کی غزل کے جوہر اور کھل کر اُجاگر ہوئے ہیں۔ اس شعری مجموعے کو پڑھ کر واقعی شعور کی گرہیں کھلتی ہیں۔ 'لاشعور' حقیقت میں شعر وشعور کی ایک ادبی دستاویز ہے جو راہیؔ کے منصب ومرتبہ کو اور بلند کرے گی۔''

ڈاکٹر معصوم شرقیؔ کے مطابق

''راہی کی شاعری محسوسات، جذبات اور مشاہدات کی شاعری ہے۔ جو نئی نسل کی معنویت کے تمام عصری تقاضوں کو پورا کرنے میں کہیں سے بھی کمزور نظر نہیں آتی ہے۔ ان کا فن ارتقا پذیر ہے۔ وہ اپنے شعر کی توانائی اور جذبے کی قوّت پر یقین رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر ہمایوں اشرف کے مطابق

غلام مرتضٰی راہیؔ کے تازہ مجموعۂ کلام ''لاشعور'' میں جس طرح کی شاعری ہے وہ کسی خاص زمانے میں Tag نہیں ہو سکتی۔ راہی زمانے کی حد بندیوں کو توڑتے ہیں اور پھر ان کے اندر رچے بسے بھی نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر مشتاق صدف کی رائے

غلام مرتضٰی راہیؔ ایک توانا اور منفرد لب ولہجہ کے شاعر ہیں۔ وہ ایک ایسی جدید اردو غزل کی آبیاری کر رہے ہیں جو صرف اور صرف انہیں کا حصّہ ہے۔ وہ ایک

ممتاز اور مقبول و معروف شاعر ہیں، ان کا ایک ایک شعر عمیق مطالعے کا مطالبہ کرتا ہے۔
'لاشعور' کو میں جدید شاعری کا ایک نیا ''ویب سائٹ'' (Web site) تصور کرتا ہوں جوان کی ادبی ریاضت کا ضامن ہے۔

ڈاکٹر امام اعظم کے مطابق

عصری حسّیت کا رنگارنگ مرقع دیکھنے کی جستجو ہو، کیف پرور، بصیرت افروز اور حیرتناک جلوؤں کی سیر کرنی ہو تو راہی کے ''لاشعور'' میں ضرور جھانکیں۔

ڈاکٹر سیفی سرونجی کے مطابق

اردو شاعری میں چند ہی ایسے نام ہیں جو صرف تخلیقی توانائی کے بل بوتے پر ایک منفرد وقار رکھتے ہیں اور اس مقام تک پہنچے ہیں جہاں پہنچنے کے لیے ایک عمر درکار ہوتی ہے، ان میں نمایاں نام غلام مرتضٰی راہی کا ہے۔

ان متذکرہ مجموعوں کے علاوہ انہوں نے صفوت علی صفوت کی دو شعری کتابیں 'مثنوی وقت' اور 'مثنوی رسول' کا اردو سے ہندی رسم الخط میں ترجمہ کیا۔ یہ دونوں کتابیں بالترتیب ۰۲۔۲۰۰۱ء میں منظر عام پر آئیں۔ سعید الظفر وسیم کے تین شعری مجموعے 'ریگ رواں، روشنی ہی روشنی اور حرف رواں کی اصلاح و انتخاب غلام مرتضٰی راہی کے ذریعہ عمل میں آیا۔ یہ مجموعے بالترتیب ۱۹۹۷ء، ۱۹۹۹ء اور ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئے۔ ۱۹۹۷ء میں ہی اندر سروپ سری واستو کا شعری مجموعہ 'شاخ لرزیدہ' منظر عام پر آیا۔ جس کی اصلاح و انتخاب بھی غلام مرتضٰی راہی کی چشم عنایت کا نتیجہ ہے۔ شاخ لرزیدہ کی پشت پر غلام مرتضٰی راہی کی ایک مؤقر رائے اندر سروپ سری واستو کی شاعری کے حوالے سے درج ہے۔ صفوت علی صفوت کی کتاب ''سواد حور'' جو ۲۰۰۷ء میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی غلام مرتضٰی راہی اسکی نشر و اشاعت کو یقینی بنانے میں پیش پیش رہے اور فلیپ پر انکی ایک اہم رائے نقش کی گئی ہے۔ غلام مرتضٰی راہی کی

خودنوشت ''منظور ہے گذارش احوال واقعی'' متواتر ''سہ ماہی رنگ'' دھنباد میں قسط وار شائع ہورہی ہے۔ جوعنقریب ''راہی کی سرگذشت'' کے نام سے کتابی شکل میں منظر عام پرآ جائیگی۔انکی خودنوشت نہایت دلچسپ اور انوکھی ہے۔غلام مرتضیٰ راہیؔ کی نثر بھی شاعری کی طرح پُرکشش اور نکیلی ہے۔شعراء ادباء ونقاد اس طرف متوجہ ہورہے ہیں۔انہوں نے متعدد اہم شخصیتوں پر مضامین لکھ کر اپنی نثری صلاحیت کا لوہا منوا لیا ہے۔غوث محمّد غوثی کا پہلا شعری مجموعہ ''عکس آئینہ'' کا انتخاب راہیؔ کا دیکھا ہوا ہے۔مختار ہاشمی کا مجموعہ کلام ''گردشِ رنگ'' کی ترتیب وتزئین میں راہیؔ کی عنایت شامل ہے۔الحاج محمّد ادریس رضوی کا ایک نعتیہ مجموعہ ''وسیلہ بخشس'' جو ۲۰۰۴ء میں منظر عام پرآیا۔اس کی اصلاح وترتیب غلام مرتضیٰ راہیؔ کے ذریعہ کی گئی ہے۔اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ سبھی نعتوں کی بحریں بھی لکھ دی گئی ہیں۔شان بھارتی کے زیر ترتیب مجموعہ کلام کی تصحیح وانتخاب بھی راہیؔ کا دیکھا ہوا ہے۔ڈاکٹر فراز حامدی کے گیتوں کے مجموعہ ''آنسو آنسو برکھا'' اور دوہوں کی کتاب ''اُردو دوہا'' بلحاظ اصلاح و انتخاب غلام مرتضیٰ راہیؔ کا مرہونِ منّت ہے۔علی گڑھ کے غوث محمد غوثی اور ثمر چھتاری کے علاوہ ساحل احمد اور سردانہ منتظر جب تک علی گڑھ میں رہے، غلام مرتضیٰ راہی سے مشورۂ سخن کرتے رہے۔علاوہ بریں اردو کے کئی معروف نوجوان شعرا وقتاً فوقتاً غلام مرتضیٰ راہیؔ سے اکتسابِ فیض کرتے رہتے ہیں۔راہیؔ کے مشورۂ سخن کا دائرہ گوناگوں اصنافِ شاعری کومحیط ہوتا ہے۔

****

غلام مرتضیٰ راہی ایک نظر میں

نام	:	غلام مرتضیٰ خاں
قلمی نام	:	غلام مرتضیٰ راہی
تاریخ پیدائش	:	۲۳/مارچ ۱۹۳۷ء (شہر فتح پور)
تعلیم	:	بی۔اے
والد	:	غلام مصطفیٰ خاں غوری (پیدائش:۱۳/مئی ۱۹۱۳ء۔وفات:۱۴/اپریل ۱۹۸۵ء)
والدہ	:	خیر النسا بنت عبدالوحید خاں (پیدائش: ۱۹۱۴ء ۔وفات: ۱۹۸۸ء)
اہلیہ	:	رئیس فاطمہ بنت سید عبدالقیوم (پیدائش:۳۲/اگست ۱۹۴۵ء)
پردادا	:	میکن خاں غوری (پیدائش:۱۷/اپریل ۱۸۰۷ء۔وفات:۳۰/اپریل ۱۹۰۴ء)
دادا	:	محمّد رمضان خاں غوری (پیدائش ۳۰/دسمبر ۱۸۷۸ء ۔وفات:۲۸/مارچ ۱۹۵۹ء)
شادی	:	۳۱/مئی ۱۹۶۲ء
باقاعدہ آغازِ شاعری	:	۱۹۶۴ء
پیشہ	:	(۱) معاون مدیر روزنامہ سیاست جدید، کانپور (۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۲ء تک)

(۲) U.P.S.R.T.C. میں اکاؤنٹس آفیسر
(۱۹۶۲ء سے ۱۹۹۵ء تک)

ملازمت سے سبکدوشی: ۳۱/مارچ ۱۹۹۵ء

تصانیف : (۱) لامکاں۔۱۹۷۱ء
(۲) لاریب۔۱۹۷۳ء
(۳) حرف مکرر۔۱۹۹۷ء
(۴) لاکلام۔۲۰۰۰ء
(۵) سدابہار غزل (ہندی میں) ۔۲۰۰۳ء
(۶) لاشعور ۔ ۲۰۰۶ء

تبدیلیٔ رسم الخط : (۱) مثنویٔ وقت (۲۰۰۱ء)
(۲) مثنویٔ رسول (۲۰۰۲ء)

خودنوشت سوانح عمری: منظور ہے گذارش احوال واقعی (راہی کی سرگزشت) (۲۰۰۹ء)

انعام واعزاز : (۱) یو۔پی اردو اکادمی کا انعام (۱۹۹۳ء اور ۲۰۰۱ء)
(۲) آل انڈیا میر اکادمی کا امتیاز میر ایوارڈ۔۱۹۹۷ء
(۳) بھارتیہ ساہتیہ کار سنسد کا اعلیٰ قومی ادبی انعام واعزاز (۱۹۹۸ء، ۲۰۰۲ء، ۲۰۰۴ء)
(۴) آل انڈیا ماجد میموریل سوس ئٹی کانپور کا ماجد ادبی ایوارڈ۔۲۰۰۵ء
(۵) بہار اردو اکادمی کا انعام واعزاز (لاشعور۔۲۰۰۶ء)

باب نمبر ۳۔

غلام مرتضیٰ راہی اور اردو غزل کی روایت

فنونِ لطیفہ کی متعدد قسمیں ہیں۔ مصوری، مجسمہ سازی، بت تراشی اور شاعری وغیرہم لیکن ان سب میں شاعری ایک مشکل ترین فن ہے۔ کارخانۂ قدرت میں اشیاء کی تغیّر پذیری ایک ایسا عمل ہے جسکے اثرات سے شاید ہی کوئی محفوظ و مامون ہو۔ علّامہ اقبال نے اسی ضمن میں کہا ہے کہ ''ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں'' شاعری کا تعلق بھی تغیر پذیری کے انہیں حرکات وعوامل سے ہے۔ چونکہ شاعر معاشرے کا ایک ذکی الحس ترجمان ہوتا ہے اسلیئے اس کے ذہن میں خواص کی کیفیت ہمیشہ موجزن رہتی ہے۔ ایک عام آدمی جس طرح کسی شئے کو دیکھ رہا ہوتا ہے شاعر بھی اسی زاویۂ نظر سے دیکھے ضروری نہیں۔ شاعر کی ایک نگاہ تیز سائنٹفک تجزیئے کی مرہونِ منت نہیں بلکہ اس کے اندر کی چشم ثلاثہ اسباب وعلل کو کریدتی ہے جسے وہ اپنے ڈھنگ سے وجدان کی کیفیت سے گذر کر موزوں کلام کو خلق کرتا ہے۔ جنگلوں میں درختوں کی وجدانی کیفیت ہوا کی یلغار کو نہیں دیکھتی بلکہ پیڑوں پر اس کے مرتسم اثرات کو مقید کرتی ہے جسے وہ الفاظ وصوت کی جامہ زیبی عطا کر کے پُر لطف مظاہر فطرت سے قرب کی فراہمی کا جواز پیدا کر دیتا ہے۔ اردو غزل کی تہذیبی، تاریخی حیثیت کو اجاگر کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اردو ادب کی مقبول ترین صنف سخن غزل کے دورِ اوّل میں جن شعراء نے غزل کو اپنے شعری اظہار کا وسیلہ بنایا تھا ان کے عہد کا سیاسی، تہذیبی ماحول کس نوعیت کا تھا یا پھر شعری مذاق کے بنیادی عناصر کیا تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی ادب کے فروغ میں خصوصاً صنفی بقا میں اس کے بنیادی لوازمات اسکی خصوصیات اسکی

تصوراتی رگ و پے میں سرایت کی ہوئی ہوتی ہیں۔ اردو غزل کا معاملہ کچھ ایسا ہے کہ اس کو Define ہی کچھ اس نوع سے کیا گیا کہ اس میں شروع سے عشقیہ مضامین نظم کئے جاتے رہے ہیں۔ غزل کسے کہتے ہیں؟ ایک عام سا سوال ہے لیکن اسکا روایتی مختصراً جواب یہ ہے کہ غزل کا مطلب محبوب سے باتیں کرنے سے ہے۔ ظاہر ہے عشق کا روایتی تصّور یہ بھی ہے کہ محبوب سے مکالمہ کرتے وقت عشقیہ کلمات ہی ادا کرنے ہیں۔ محبوب کا سراپا عاشق کی نگاہ میں منعکس ہوا کرتا ہے۔ یہ شرط محبوب کی موجودگی یا عدم موجودگی دونوں صورتوں میں ہوسکتی ہے۔ شاعر محبوب کے ظاہری حسن کو مرکزی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہوئے اس کے ناز و ادا کی بھرپور اور دلکش ترجمانی کرتا ہے۔ محبوب کی عشوہ طرازیاں، اس کے نخرے، انداز سپردگی، آنکھ، بھویں، تل، عارض، باہیں، مخروطی انگلیاں، جلد کی رنگتوں، چھیڑ چھاڑ، قربت، جدائی کو اپنے موضوعات میں سمیٹ کر دلفریب انداز سے پیش کرتا ہے۔ اردو غزل کے یہی لوازمات مختلف ادوار میں اپنے رنگ و روپ بدل کر نئی شکل اختیار کرتے رہے ہیں۔ کہنے کو یہ اسمگل کی ہوئی صنف ہے لیکن اس میں کسی بھی رنگ میں ڈھل جانے کی فطری صلاحیت موجود ہے۔ یہ کافر ایرانی حسینہ ہر ایرے غیرے کو منہ نہیں لگاتی ہے لیکن جس کے پلّے بندھ جاتی ہے اسے چھوڑتی بھی نہیں۔ نوابوں کے عہد میں کوٹھے کی زینت بننے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے اور انقلاب آفریں صدا پر لبیک کہہ کر غیر مستحق کا اختیار بھی سلب کر سکتی ہے۔ مزدوروں، دبے کچلے عوام، استحصال کے خلاف آواز بھی بلند کر سکتی ہے۔ انقلاب زندہ باد کے نعرے سے پہلے آنچل کو پرچم بنا لینے کا مشورہ بھی دیتی ہے۔ اور نئی صبح کا خیر مقدم اپنے دلفریب انداز میں کرتی ہے۔

محولہ کوائف کی پیشکش کے باوجود مجھے یہ لکھنے میں عار نہیں ہے کہ اس کا لہجہ رومانی قائم رہتا ہے۔ انسانی سرشت میں رومان کا تصور شروع سے موجود ہے۔ جب

تک ہم جنگل میں رہے ہماری تہذیب بھی جنگلی رہی۔ وہاں بھی ہم نے پیڑوں کی ٹکراہٹ سے آگ کی تہذیب برآمد کی۔ یہ آگ محبت کی بھی تھی، جہاں شیر، ہرن، باگھ، ہاتھی، چیتا، لومڑی ایک ہی قبیلے کے باشندے تھے لیکن وہاں بھی ان کے درمیان محبت کا پیغام موجود تھا۔ انسان شکاری کی حیثیت سے جنگل میں داخل ہوا اور جانوروں کے عشق و محبت سے سبق سیکھ کر باہر آیا۔ محبت و اخوت کی داستان اس نے باہر آ کر سنائی۔ ہماری تہذیب کے ترقی یافتہ دور کے مخصوص حضرات نے صنف شاعری کو محبت کے اظہار کے لئے وسیلۂ اظہار منتخب کیا۔ شعراء حضرات اسی قبیل سے تعلق رکھتے تھے۔ اس صنف میں عشق و معاشقے کا روایتی اظہار جس کمال فن سے پیش کیا گیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ ہر چند کہ اسے فرسودہ اور اخلاقی زوال سے تعبیر کریں یہی شعری رویّہ صدیوں تک اردو غزل کے فطری اسباب و علل کا نتیجہ رہا ہے۔ تذکرۂ شعرائے اردو کے مصنف مولانا حکیم سید عبدالحیؒ صاحب مرحوم نے اپنی مشہور تصنیف ''گل رعنا'' میں لکھا ہے ''جہاں تک چھان بین کی گئی ہے سب سے پہلے امیر خسرو نے جن کی طبیعت اختراع میں اعلیٰ درجہ صنعت و ایجاد کا رکھتی تھی۔ ملکِ سخن میں برج بھاشا کی ترکیب سے انشا پردازی کا ایک طلسم خانہ کھولا، کہہ مکرنی، دوسخنی گیت، دوہے، پہیلیاں خاص انکے کمال کا جوہر بھی خالق باری کو بھی ان ہی کی طبع رسا کا نتیجہ سمجھو تو اس حیثیت سے اس نظم کو اردو کی داغ بیل قرار دینا ایک حد تک ٹھیک ہے۔ خسرو نے چونکہ دوہے بھی لکھے ہیں اس لئے خسرو کی رنگارنگ طبیعت میں دوہا ایک ایسی صنف بن کر منظر عام پر آیا جس میں غزل جیسی لچکدار ہیئتی اور فکری نظام کا اظہار دیکھنے کو ملتا ہے۔''[1]

کلیات قطب شاہ پر سرسری نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ اس کے یہاں غزل کے بنیادی اوصاف جیسے معاملہ بندی، عشقیہ اظہار

---

[1] گل رعنا۔ مولانا حکیم سید عبدالحی

حسین ترین پیرائے میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔لطافتِ عاشقانہ کا جہاں تک معاملہ ہے قلی قطب شاہ حافظ شیرازی سے بہت زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں۔وجہیؔ،قلی قطب شاہ کے نہ صرف ہم عصر تھے بلکہ ہم سر بھی تھے۔وجہیؔ کا خاص میدان مثنوی نگاری تھا لیکن انہوں نے غزلیں بھی کہیں ہیں جس میں تصوفانہ حقائق کو رازداری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ہر چند کے قلی قطب کی اہمیت خشتِ اوّل کی طرح ہے لیکن جہاں تک سرمائے کا سوال ہے وجہیؔ اپنی مثنوی کی وجہ سے بہت آگے ہیں۔شوقیؔ اسی کڑی کے شاعر ہیں لیکن ادبی تاریخ کے حوالے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ انہوں نے غزلیں نہیں کہیں ہیں۔عبداللہ قطب شاہ غواصی کے تذکرے ملتے ہیں لیکن غواصی کے کلام میں بہ اعتبارِ تخلص بھی گہرائی ہے اور شعوری طور پر بالغ نظر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ان کے کلام میں ہندی الفاظ کا استعمال کثرت سے دیکھنے کو ملتا ہے۔ابن نشاطی، ابوالحسن،تاناشاہ،فائز کے بعد بحریؔ ایک ایسے شاعر ٹھہرتے ہیں جو شاعر سے کہیں زیادہ صوفی ہیں۔انکی غزلیات کا ایک دیوان پرانی لائبریری میں موجود ہے۔اس کے بعد باضابطہ طور پر ارضِ دکن کے سلطانِ غزل ولی کا نام سرِفہرست آتا ہے۔جنہوں نے غزل کو اس رتبے تک پہنچایا کہ بیک وقت دکن اور شمالی ہند میں اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کر کے سکّہ جمالیا۔ولیؔ کے یہاں دو طرح کے مضامین کثرت سے دیکھنے کو ملتے ہیں (۱)تصوفانہ (۲)تغزل واخلاق۔

تصوف میں یہ کسی سے متاثر نظر نہیں آتے اس لئے کہ وسیلہ اظہار کے لئے جو طرز ہنر اختیار کرتے ہیں وہ ہندی اور فارسی کی آمیزش سے مملو ہے۔ولیؔ دکنی نے دہلی میں جب بود و باش اختیار کی تو دہلوی رنگ اختیار کرلیا۔ولیؔ کے دہلی آنے سے ایک فائدہ اردو غزل کو یہ ہوا کہ ہندی الفاظ کے کثرتِ استعمال پر روک سی لگ گئی۔ولیؔ دکنی کے زیر اثر دہلی کے شعراء نے بھی انکا تتبع کیا اور غزل فارسی آمیز ہونے لگی۔ولی

نے ایک طرح سے دہلی کے شعراء میں ممتاز مقام حاصل کرلیا۔ یہ مقام انہیں طرز تخیل اور زور کلام کی وجہ سے حاصل ہوا۔

ولیؔ کے ایک ہم عصر فائز دہلوی کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ان کے کلام کا موضوع سیدھا سادہ، ظاہری حسن اور مجازی محبت ہے۔ اس عہد کے ایک اہم شاعر آبروؔ کا نام بھی سامنے آتا ہے۔ ان کا کل سرمایہ بتّیس غزلیں ہیں۔ ولیؔ کے ہم عصر آبروؔ انتہائی کہنہ مشق شاعر تھے۔ کلام میں نفاست، صاف ستھرائی، رعایت لفظی کے استعمال میں دیگر شعراء سے کافی آگے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں وسعت پیدا نہ ہوسکی۔ ایک شعر ملاحظہ ہو۔

رستم اس مرد کی کھاتے ہیں قسم زوروں کی
تاب لادے جو کوئی عشق کے جھکجھوروں کی

اسی عہد کے ناجیؔ، یک رنگؔ، آرزوؔ، مضمونؔ، امیر خاں انجام ایسے شعرا گزرے ہیں جن کے یہاں بالترتیب سماجی اقتصادی مسائل، عوامی ذوق، تخیلاتی عناصر، علمی تبحر، شیریں زبانی کا پتہ چلتا ہے۔ اردو شاعری کا دوسرا دور تقریباً یہیں ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرے دور کے اہم شعراء میں یہ کریڈٹ صرف ولیؔ کے سر بندھتا ہے کہ اس نے ہندی بھاشا کے الفاظ کے علاوہ جو خاص چیز اردو میں منتقل کی وہ بھاشا کی شاعری کے ذریعہ اظہار بن گئے۔ ولیؔ کا یہ بھی کمال ہے کہ اردو کی عاشقانہ شاعری میں بھاشا کے استعمال سے ایک مخصوص قسم کا رنگ پیدا ہوگیا تھا۔ اس دور کی تیسری خصوصیات ایہام گوئی ہے جو ہندی کے دوہوں سے نکل کر اردو زبان میں آئی۔ حالانکہ ناقدین یہ بھی بتاتے ہیں کہ اس سے ہماری شاعری کا مزاج بگڑ گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیدھی سادی بات کو بھی ذومعنی بنانے کے چکر میں لطف شعر جاتا رہا۔ بھاشا کا اتنا گہرا اثر پڑا کہ اس سے کبھی نجات حاصل نہ ہوسکی حالانکہ اردو غزل کو ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ

سیدھے سادے الفاظ میں اہم نکتے بیان کردیئے گئے۔مثال کے طور پر یہ اشعار ۔

جدائی کے زمانے کی سجن کیا زیادتی کہیئے
کہ اس ظالم کی جو ہم پر گھڑی گذری سو جگر بیتا
ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا
صبر ایوب کیا گریۂ یعقوب کیا

ولؔی کے بعد حاتؔم کا ذکر ملتا ہے جو مضمونؔ ، ناجیؔ اور آبرو کے ہم عصر تھے۔ حاتؔم نے ہندی کے ثقیل الفاظ کو اردو میں منتقل کرنے سے شعوری طور پر گریز کیا ہے۔ فصاحت اور زبان کی نزاکت کو مدّ نظر رکھا۔ نمونہ کلام ۔

اے خردمندوں مبارک ہو تمہیں فرزانگی
ہم ہوں اور صحرا ہو اور وحشت ہو اور دیوانگی

اس کے بعد فغاں کا نام لیا جاتا ہے جو بڑے ہی ظریف اور فطرتاً شاعرانہ طبیعت لے کر پیدا ہوئے تھے۔ میر تقی میرؔ نے انہیں قزلباش خاں امید کا شاگرد لکھا ہے جبکہ مصحفی نے انہیں ندیؔم کا شاگرد کہا ہے۔ نمونہ کلام ۔

صنم بتا تو خدائی کا مجھکو کیا نہ ہوا
ہزار شکر کہ تو بت ہوئے خدا نہ ہوا
کباب ہو گیا آخر کو کچھ برا نہ ہوا
عجب یہ دل ہے جلا بھی تو بے مزہ نہ ہوا

مظہر جان جاناں کی ہستی اردو شاعری کا روشن باب ہے۔ مرزا جان جاناں عالم و فاضل ہی نہیں اہل علم سے حدیث، فقہ کی تعلیم بھی حاصل کی۔ مظہر جان جاناں کا احسان صرف اردو شاعری پر ہی نہیں ہے بلکہ اسلام کی تبلیغ میں بھی غیر براہِ راست طور پر انہوں نے حصہ لیا۔ تصوف کا رجحان ان کے اشعار میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

نمونہ کلام۔

چلی سب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا

اس قبیل کے شعر میں تصوفانہ شاعری کا مزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔

اس کے بعد کا جو دور شروع ہوا اس میں سودا کا نام نامی سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔سودا ابتدائی دور میں فارسی میں ہی شعر کہتے تھے۔فارسی میں انکی پُر گوئی کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے استادوں سے داد و تحسین حاصل کرنے میں کامیاب رہے تھے۔سودا کی ابتدائی شاعری حسن و عشق کے معاملات میں خصوصیات کی حامل ہے انہیں 'پہلوانِ سخن' سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔انکی طبیعت میں ہمہ گیری اور جولانی اپنا الگ رنگ دکھاتی ہے۔خصوصاً غزل میں سودا کے حوالے کے بغیر روایتی شاعری کی تاریخ مرتب نہیں کی جا سکتی۔ان کا کمال یہ ہے کہ کلام کا زور نزاکت مضمون سے اسطرح پیوست ہوتا ہے کہ آگ کے شعلے میں گرمی سے جسطرح روشنی کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔الفاظ کا انتخاب،شعر کی بندش میں چستی،معنویت میں گہرائی۔دردانگیزی،تاثیر آفرینی ان کی غزل کے محاسن ہیں۔سودا کے کلام میں تشبیہ و استعارات پرانے سے ہیں لیکن ذرا سی الٹ پھیر سے کلام پر لطف ہو جاتا ہے۔ان کی غزلوں میں اپنے وطن کی خوشبو،ہندو مذہب کی اہم شخصیات ارجن کا ذکر،ساون مہینے کا خاکہ،کرشن کو شاعری میں مقدس لوگوں کے زمرے میں رکھکر حوالہ دینا ان کے کلام کا خاصہ ہے۔ہندی الفاظ کے استعمال سے بھی پرہیز انہوں نے نہیں کیا ہے۔شعر کا مذاق اتنا بلند ہے کہ ہندی کے ملائم الفاظ جیسے پربت،رائی وغیرہ کا استعمال مخصوص معنوں میں کیا گیا ہے۔غزل کے باب میں ان کا رنگ استادانہ اور غیر عامیانہ ہے۔سودا کے کلام میں ان الفاظ کا استعمال کثرت سے ملتا ہے جو انکے پیش رووٴں کے یہاں مفقود ہے۔لفظ و معنی میں

ان کے یہاں ترکیب ٹکراتی نہیں بلکہ انفرادی شان کو ظاہر کرتی ہے۔ایک رنگین سا شعر سودا کی ذہنی طبیعت کا پتہ دیتا ہے۔

دیکھوں نہ کبھی گل کو ترے منہ کے میں ہوتے

سُنبل کے سوا زلف تری بو نہ کروں میں

محولہ شعر میں سودا کا رنگ کھل کر سامنے آیا ہے۔اپنے محبوب کے چہرے کو اوّلیت دیتے ہوئے گل سے پرہیز کرنے کا مظاہرہ یہاں دیکھتے بنتا ہے۔سونگھنے کی ترکیب کو 'بو نہ کروں میں' کہکر سودا نے ایک مخصوص شعری زبان وضع کر لی ہے۔ جو روایتی شاعری کے لئے اثاثہ ثابت ہو چکا ہے۔سودا نے مختلف اصناف سخن میں اپنا زور کلام دکھلایا ہے لیکن غزل میں تاثیریت کو سب سے پہلے سودا نے مرکز توجہ کی حیثیت دی ہے۔سودا سے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ غزل میں ایسے ایسے سطحی مضامین باندھے ہیں جس سے رومانی فضاء بوجھل ہو کر پست ہو گئی ہیں۔

سودا کے بعد جس نے اردو روایتی شاعری میں ہمہ گیر مقبولیت حاصل کی ان میں خواجہ میر درد کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔تصوفانہ شاعری کا جب بھی ذکر آئیگا خواجہ میر درد نہ صرف کثرت سے یاد کئے جائیگے بلکہ بطور حوالہ بھی انہیں پیش کیا جائیگا۔چونکہ ان کا سلسلہ نسب خواجہ بہا الدین نقشبندی سے ملتا ہے۔اس لئے تصوف میں ان کے ورثہ دار بننے میں کوئی کلام نہیں ہے۔اردو کی روایتی شاعری تصوفانہ رنگ سے بھری پڑی ہے لیکن خواجہ میر درد ان میں اپنے معاصرین سے کسی سے کم نہیں۔ مضمون کو باندھنے کا سلیقہ درد کو ممتاز و منفرد بناتا ہے۔ثقیل الفاظ سے بھی ہنرور کی طرح شعریت پیدا کرتے ہیں۔درد کے بعد قابل ذکر شعراء میں سوز اور حسن کا نام سامنے آتا ہے۔سوز جیسا کہ تخلص سے ظاہر ہے انہوں نے اپنی کھلی آنکھوں سے دہلی کی تباہی دیکھی ہے اس سے متاثر ہو کر اپنی فقیرانہ طبیعت کے ساتھ لکھنؤ وارد ہوئے۔ بعد میں

انہوں نے لکھنؤ میں ہی سکونت اختیار کی۔ سوز کا کلام تصنّع اور تکلّف سے ماورا ہے۔ غزل گوئی کیلئے جس طرح شیریں سخن لازم شرط ہے میر سوز نے آخری دم تک غزل کو اس خصوصیت سے سنوارا۔ سوز غزل میں محتاط روی کے انداز کو اپنانے والوں میں تھے۔ انکے یہاں فارسی ترکیبیں بہت کم ہیں۔ ایک بات سوز کو دیگر شعراء سے منفرد کرتی ہے وہ یہ ہے کہ قوت بیاں کا مادّہ کم ہونے کے باوصف ان کے کلام میں خوش مذاقی لطف فزوں تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسی قبیل کے دوسرے شعراء میں حسن کا ذکر ملتا ہے۔ ان کا نام میر غلام اور حسن تخلص تھا۔ ان کے والد میر ضاحک خود بھی مشہور شاعر تھے۔ اس لئے سہولت کے پیش نظر ابتدائی کلام پر انہیں سے اصلاح لی۔ ان کے یہاں بھی تصوف اور روحانیت کا قابل دید مظاہرہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ مخصوص لفظوں کو برتنے کا چسکہ حسن کی شاعرانہ طبیعت کا مظہر ہے۔ حالانکہ حسن مثنوی کے شاعر ہیں لیکن غزل میں انہوں نے اپنا رنگ برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ انکو سب سے زیادہ شہرت مثنوی 'سحر البیان سے ملی۔ اس کے بعد کا دور میر کی شاعری کا دور ہے جو بیک وقت ناخدائے سخن بھی ہیں اور زندگی میں اسیر زلف بُتاں بھی۔ میر تقی میر کے حوالے سے اردو شاعری کے سلسلے میں جب بھی کچھ لکھا جائے گا انکا سوز و گداز، حزنیہ رنگ یاد کئے جاتے رہیں گے۔ پوری اردو شاعری میں میر تقی میر ہی ایک ہمہ گیر شخصیت ہیں جن میں زندگی کے سارے نشیب و فراز، ٹریجڈی، کامیڈی طبیعت کی رنگینی، لا حاصلی میر کے آنسوؤں سے چمکنے والے جگنو کی روشنی میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ جس طرح اندھیری رات میں جگنو اپنے جلنے اور بجھنے کی کیفیت کو پیش کرتا ہے۔ میر کے کلام کا دو آتشہ بھی ایسا ہی ہے۔ ریختی کے استاد ہونے کا معاملہ ہو یا حسن و عشق کی جلوہ سامانی بکھیرنے کا معاملہ شعر میں چست بندش کا معاملہ یا سہل ممتنع کو برتنے کا ہنر میر کا کوئی ایک ایسا رخ سامنے رکھا جائے تو بھی اس کی طبیعت کی شش جہاتی گونج سے ایوان غزل میں ترنم سحر انگیز ہو سکتا

ہے۔ میرؔ کو ایک عہد ساز شاعر قرار دینے میں تامل سے کام نہیں لیا جاسکتا۔ عہد ساز ہونے کے لئے اس عہد کا نباض ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ماضی کی متعاقب پر چھائیوں کو بھی نگاہ میں رکھنی ہے اور مستقبل کی بشارت سے پرہیز کرنے والے عناصر سے معاملات طے کرنے کی سبیل نکالنے کی بھی ضرورت ہے۔ اس زاوئیے سے میرؔ کے کلام کی خصوصیت کا ہم مطالعہ کرتے ہیں تو میرؔ ثابت قدم نظر آتے ہیں۔ میرؔ کے متعلق ناسخؔ کے حوالے غالبؔ نے کیا پتے کی بات کہی ہے۔

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ\
آپ بے بہرہ ہیں جو معتقدِ میرؔ نہیں

میرؔ کی تعریف میں غالبؔ نے زمین و آسمان کے قلابے ملا دئے ہیں۔ اسکی ایک فطری وجہ بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر میرؔ نہ ہوتے تو غالبؔ غالب نہ ہوتے۔ یہ سلسلہ سیاسی، سماجی، تہذیبی، ادبی پس منظر میں کلامِ اقبال تک ملتا ہے۔ شعروادب میں ہر پیش رو اپنے آنے والے راہرو کو بہ آسانی راستہ دینے کیلیئے تیار نہیں ہوتا۔ تھوڑی دور ساتھ چلنے سے ہی منزل نہیں مل سکتی۔ میرؔ کے کلام میں بظاہر سہل پسندی دکھائی دیتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ میرا تنا ہی Complex شاعر ہیں۔ میرؔ آسان، عام فہم الفاظ کی شاعری کرتے ہوئے دور کی کوڑی لانے میں نہیں چوکتے۔ میرؔ زندگی کو جس طرح دیکھتے ہیں اسی طرح پیش کر دیتے ہیں لیکن اس پر برہنگی کا الزام نہیں آسکتا۔ میرؔ نے زندگی کو بلیغ معنی میں استعمال کیا ہے۔ یہ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے کہ میرؔ کے ذہن کی بازیافت تک ہم پہنچ پاتے ہیں یا نہیں۔ میرؔ نے صاف طور پر کہا ہے۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے\
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

اس شعر میں تین بار ہوئے کی تکرار سامنے آئی ہے اور کہیں لطافت شعر بالکل

نہیں بگڑتی اس کو کمال ہنر کہا جا سکتا ہے۔
سوداؔ میر تقی میرؔ کے ہم عصر اور اردو زبان کے مایہ ناز شاعر تھے ابتداء فارسی شاعری سے کی۔ بعد میں خان آرزوؔ کے کہنے پر اردو کی طرف راغب ہوئے۔ شعر گوئی کی غیر معمولی صلاحیت، پُر گوئی اور قادر الکلامی کی وجہ سے سوداؔ کو ملک الشعراء کہا جاتا تھا۔ انکی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ معیارِ شعر کبھی مجروح نہیں ہوا۔ ہمیشہ انہوں نے معیار کی یکسانیت کو بنائے رکھا۔ انکے لہجے میں بلند بانگ اور مردانہ پن شروع سے رہا ہے۔ سوداؔ کو پہلوانِ سخن کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ سوداؔ کی غزلوں میں انکے مزاج قصیدہ کی چھاپ نظر آتی ہے۔

مقدور نہیں اسکی تجلی کے بیاں کا
جوں شمع سراپا ہو اگر صاف زباں کا
سوداؔ شرابِ عشق نہ کہتے تھے ہم نہ پی
پایا مزہ نہ تونے اب اسکے خمار کا

اس دور کے تیسرے بڑے شاعر خواجہ میر درد تھے۔ درد صوفیانہ مزاج رکھتے تھے۔ اس لئے ان کی شاعری میں تصوف کا رنگ جھلکتا ہے اور یہی اندازِ شعر انکی انفرادیت ہے۔ درد نے اپنی شاعری میں اپنے قلب کے ان ہی جذبات و کیفیات کو اجاگر کیا ہے جسے وہ اعتماد کے ساتھ بیان کی قدرت رکھتے تھے۔ اس لئے وہ میر کی طرح سارا شاعرانہ تجربہ بیان میں نہیں لاتے۔

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے
درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کیلئے کچھ کم نہ تھے کرّو بیاں

میر درد کے بعد تاریخِ ادب میں جن شعراء کا نام آتا ہے ان میں قائم چاند پوری، میر سوز اور میر اثر اہمیت کے حامل ہیں۔لیکن ان کا المیہ یہ ہے کہ یہ میر اور سودا جیسی قد آور شخصیتوں کے زمانے کی پیداوار ہیں۔کہا جاتا ہے کہ تناور اور بڑے درختوں کے سائے میں چھوٹے پودوں کا پنپنا محال ہے۔بس یہی حال ان تینوں شعراء کا ہوا۔میر اور سودا کی شاعری اور انکے اثرات تلے ان کی آواز دب کر رہ گئی۔اس کے بعد میر حسن کا دور آیا۔میر حسن کو مثنوی 'سحر البیان' سے جو شہرت ملی کسی اور اصناف سخن سے نہیں۔میر حسن کی غزلیات کے مطالعہ سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ یہ اپنے پیش روؤں کی روایت کی پاس داری کرتے ہوئے اس دور کے نوجوان شعراء کی بھی تقلید کر رہے تھے۔اس لئے ان کی غزلوں میں نہ تو میر، سودا جیسی کھنک پیدا ہو سکی نہ تو سوز، انشاء اور جرأت کی طرح انفرادیت۔شعر ملاحظہ ہو۔

شب فراق میں رو رو کے مر گئے آخر
یہ رات جیسی تھی ویسی رہی سحر نہ ہوئی

میر حسن کے بعد اردو ادب میں جو نام نمایاں طور پر لیا جاتا ہے وہ جعفر علی حسرت کا ہے۔انہوں نے اردو شاعری کو ایک نیا طرز بخشا اور لکھنؤ کے نئے لکھنے والے شعراء کو تحریک دیکر ان میں شعری شعور پیدا کیا۔انکی شاعری میں میر، سودا اور درد کی روایت کا رنگ و آہنگ بدلتا نظر آتا ہے۔اور اسکی تقلید کرتے ہوئے حسرت کے شاگرد قلندر بخش جرأت نے اپنی شاعری میں انفرادیت قائم کی۔اسی دور کے قابلِ ذکر شعراء میں میر محمد بیدار، قدرت اللہ قدرت اور جوشش کا نام لیا جاتا ہے لیکن انکی شاعری بھی پامال ہو کر رہ گئی کیونکہ انکی شاعری مزاج اور آہنگ کے نظریہ سے میر اور سودا سے مختلف طرز کی تھی اور درد سے قریب ہوتے ہوئے بھی قریب نہیں تھی اس لئے ایک مخصوص مزاج کا اظہار لوگوں کو راس نہیں آیا۔قدرت کے طرز شاعری کی اپنی ایک

الگ روایت ہے انکی شاعری میں شعور و ادراک کے ساتھ ساتھ کائنات میں رونما ہونے والے نشیب وفراز پر گہرا مشاہدہ ہے۔انکی آواز میر،سوز، قائم، درد سب سے جداگانہ ہے۔

جوشش بنیادی طور پرغزل کے شاعر تھے انکا اپنا کوئی رنگ وآہنگ نہیں تھا انکی شاعری میں جہاں سودا کا رنگ ہےتو میر اور درد کا بھی اچھوتا انداز شامل ہے۔مشکل سے مشکل ترین زمینوں میں غزل کہنے کی قدرت رکھتے تھےلیکن انکے یہاں تخلیقی قوت میں وہ پائیداری نہیں ہے جو میر،درداور سودا میں موجود ہے۔

میر اور درد کی شاعری کی مشترکہ خصوصیات میں حزنیہ رنگ سر چڑھ کر بولتا ہے۔کچھ ڈگر سے ہٹ کے الگ کسی شاعر کی آواز صدائے منفرد ٹھہرتی ہے تو آتش ہمارے سامنے آتے ہیں۔آتش کے کلام میں بہ لحاظِ تخلص اور طبیعتاً بھی سوزِ جگر اور دل کی خلش کو ظاہر کرتے نظر آتے ہیں بندشِ الفاظ اور بانک پن کے معاملے میں آتش کے کلام کو دیگر شعراء پر خاصی فوقیت دی گئی ہے۔مثال کے طور پر بقولِ آتش

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

آتش کو بجا طور پر احساس تھا کہ اس کے کلام کے کن محاسن کی بدولت انھیں شہرت حاصل ہے۔بیشتر شعراء اپنے بارے میں مبالغہ آمیزی کی حد تک اپنی شاعری کے بارے میں کلماتِ فصیح سے نوازتے رہے ہیں لیکن آتش نے بنیادی طور پر جن نکات کی طرف سختی سے عمل پیرا ہونے کی بات کہی ہے ان میں بندشِ الفاظ کافی اہمیت کی حامل ہے۔بندشِ الفاظ کی سرسری طور پر اہمیت یہ بھی ہے کہ اسکے بغیر کوئی شاعر اپنی شاعری میں روانی اور سلاست نہیں پیدا کرسکتا سو آتش کا دعویٰ کھوکھلا نہیں ہے انھوں نے کسی محولہ شعر میں ''مرصع سازی'' پر بھی زور صرف کیا ہے یعنی ایسی شاعری نک سک

سے نہ صرف درست ہو بلکہ سجی سنوری بھی ہو۔ ظاہر ہیکہ غزل کو طرحدار ہونے کیلئے عروسِ سخن کی خوشنمائی بےحد ضروری ہے۔ باالفاظِ دیگر اسے حسنِ کلام بھی کہہ سکتے ہیں۔

آتش کے کلام کا ایک بڑا حصہ عشقیہ شاعری پر محیط ہے لیکن اپنے معاصرین میں بھی اسلئے یہ ممتاز ہے کہ انھوں نے اپنے کلام کو ابتذال سے بچائے رکھا ہے۔ عشقیہ شاعری میں ہوس ناکی کے عناصر آنے کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ لیکن اندازِ اظہار میں سُوقیانہ نہیں ہو تو اسکا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

الٰہی ایک دل کس کس کو دوں میں
ہزاروں بت ہیں یاں ہندوستان میں

اس شعر میں ہندوستان کے حوالے سے 'بت' لفظ کا استعمال اس شعر کی زیب و زینت میں اضافے کا سببِ خاص دکھائی دیتا ہے۔ آتش کے اور چند اشعار تفنّنِ طبع کیلئے حاضرِ خدمت ہیں۔

یار کو میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا
رات بھر طالع بیدار نے سونے نہ دیا
شب وصل تھی چاندنی کا سماں تھا
بغل میں صنم تھا خدا مہرباں تھا

ولیؔ، میرؔ، دردؔ، آتشؔ کی شاعری کے اسباب وعلل کے وسیع تر مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ اردو کی غزلیہ شاعری میں ان حضرات کی حیثیت سنگِ بنیاد کی سی ہے۔ ہر چند کہ انکے پیش رووٴں کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ لیکن غزل کے قلب ماہئیت میں منقلب موضوعات کو جاری و ساری کرنے میں انھوں نے جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں وہی ہمارے شعری سرمائے کا ماخذ بھی ہیں۔ اور مومنؔ غالبؔ کی جودتِ طبع کیلئے محرّک بھی۔ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ غزل میں صفائی ستھرائی اور

نزاکتِ لفظی کے بھر پور استعمال سے آنے والی نسل کے نمائندہ شعرا میں غالب اور مومن نے بہت فائدہ اٹھایا۔ یہ بھی طئے ہیکہ ہمارا شعری ورثہ لاکھ قابلِ اعتنا ہو اگر غالب اور مومن جیسے فقیہ المثال شعراء ہمیں نصیب نہ ہوتے تو اردو غزل سدا کم مائیگی کا شکار رہتی۔ غالبؔ کے متعلق کچھ بھی لکھنا اضافے کا باعث نہیں ہوسکتا۔ اسلئے کہ غالب صرف نباض وقت ہی نہیں ایک **Versatile Genius** تھا۔ اس نے کھلی آنکھوں سے ۱۸۵۷ء کا غدر بھی دیکھا تھا اور بے آبرو ہوتی دہلی کا نظارہ بھی کیا تھا۔ مشہور ناقد رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ مغلیہ سلطنت نے ہندوستان کو تین چیزیں دی ہیں۔ تاج محل، اردو اور غالبؔ۔ تاج محل اور اردو کی اہمیت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے لیکن غالبؔ کے تعلق سے ہم بہت سی باتوں سے ناآشنا ہیں۔ اردو کے ساتھ غالبؔ کا علاقہ براہِ راست نہ ہوکر غیر براہِ راست ہے۔ اسلئے کہ غالب خود کہتے ہیں

طرزِ بیدلؔ میں ریختہ کہنا
اسداللہ خاں قیامت ہے

سبھی جانتے ہیں کہ بیدلؔ عظیم آبادی کس پائے کے شاعر تھے انکا فارسی کلام چشمِ غالبؔ کیلیئے ہی سرمئہ بصیرت نہیں۔ بیشتر فارسی غزل گویوں نے انکی شاعری سے استفادہ کیا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ غالبؔ اپنی فطری ذکاوت سے بیدلؔ کے زیادہ قریب پہنچتے دکھائی دیتے ہیں۔

ریختی کہنے میں غالب خود کو استاد کا درجہ دیتے ہیں اور اسی بہانے اپنے پیشرو میرؔ کی بھی پذیرائی کرتے ہیں۔

ریختی کے تمھیں استاد نہیں ہو غالبؔ
سنتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

غالبؔ کے کلام کی خصوصیات پر متعدد صفحات سیاہ کیئے جاسکتے ہیں انکے

محاسن اشعار دوسرے شعراء کی بہ نسبت عرق ریزی کے بعد ہی سمجھ میں آسکتے ہیں اسلئے غالبؔ کی شاعری کو سمجھنے کیلیئے کافی دراک ہونے کی ضرورت ہے۔انکے اشعار عوام وخواص دونوں ہی جگہ مقبول ہیں یہ سارا کام اسلئے ہوا کے غالب نے جب اردو میں شاعری کی شروعات کی تو اسکا رنگ ہی کچھ اور تھا۔غالبؔ نے اپنے پیش رو کی نہ صرف حسین روایت کی عمارت کو رنگ وروغن عطا کیا بلکہ انھوں نے اقبالؔ جیسے عظیم مفکّر اور فلسفی شاعر کو بھی نہ صرف متاثر کیا بلکہ اقبالؔ کیلیئے راہیں آسان کیں۔

غالبؔ کا یہ شعر

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

خدا سے مکالمہ کرنے کا ہنر ہی پیش نہیں کرتا بلکہ اقبالؔ کے اس شعر

باغِ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں؟
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

لکھنے کی بھی تحریک دی تھی۔

غالب کے بہت سارے اشعار اسلئے بھی زبان زد ہیں کہ اسکے محاورے پر لطف اور خیالات مختلف الجھات ہیں۔مثال کے طور پر

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
رنج کا خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں
بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

حکیم مومن خاں مومنؔ ایک ایسے شاعر ہیں جنہیں غالبؔ کا ہم عصر ہونے کا رُتبہ حاصل ہے۔مومن غالبؔ کی طرح فارسی پر بھی عبور رکھتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ ان کا ایک دیوان جو غزل، قصیدہ، مثنوی اور رباعی پر مشتمل ہے شائع ہوا تھا۔مومن کا نہ صرف شعری سرمایہ بلکہ نثری سرمایہ بھی لائق اہمیت ہے۔انشائے مومن کے نام سے شائع ہونے والی فارسی نثر پر مشتمل کتاب عنقا ہے لیکن اس کی گونج ان کے عہد میں برقرار تھی۔مومن کی غزل گوئی کا اپنا ایک مزاج ہے۔ان کا لہجہ بلند بانگ ہے اور دلوں پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔انہیں بنیادی طور پر غزل کا شاعر کہا جاتا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ غزل اور مومن ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم تھے۔یوں تو انہوں نے دوسری اصناف میں بھی کمالات دکھائے ہیں لیکن اصل جوہر غزل میں ہی کھلتا ہے ایک واقعہ آج بھی بیان کیا جاتا ہے کہ مومن کے اس شعر۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کے بدلے غالبؔ نے اپنا دیوان دے دینے کی بات کہی تھی۔مومن کے کلام میں دوسرے شعراء کی بہ نسبت شعریت بھری پڑی ہے۔ضرورت اسے کریدنے کی ہے۔مومن کے کسی ایک شعر پر غالبؔ کا دیوان نذر کرنا محض واقع پر محمول نہیں کیا جاسکتا بلکہ

غالبؔ کی مومن کو تسلیم کر لینے کی فراخدلی بھی ظاہر کرتا ہے۔فراخدلی سے مراد یہ ہے کہ مومن کا شعور شاعری انہیں پسند آیا۔

مومنؔ نے خود کو صورت پرست کہا ہے یہ صورت پرستی بت طناز کے لئے بھی ہے اور عشقِ حقیقی کے سامنے خود سپردگی کے لئے بھی۔مثال کے طور پر درج ذیل اشعار پیش کئے جاسکتے ہیں۔

شعلۂ دل کو ناز تابش ہے
اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا
اب یہ صورت ہے کہ اے پردہ نشیں
تجھ سے احباب چھپاتے ہیں مجھے

مومنؔ کے کلام کی دوسری خصوصیت علامتوں اور اشاروں کی نیرنگی ہے ان کی رمزیت میں بھی کھلا پن ہے۔زبان کی سادگی اور بیان کی رنگینی نازک خیالی، معنی آفرینی سبھی سے جداگانہ ہے مثال کے طور پر۔

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مومنؔ کا یہ شعر غزل کے مخصوص مزاج کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے۔

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

بحیثیت مجموعی مومنؔ کا ذکر کئے بغیر اردو غزل کی تاریخ نامکمل رہے گی۔مومنؔ کے بعد جس شاعر پر نظر پڑتی ہے وہ شاد عظیم آبادی ہیں۔شاد عظیم آبادی نے جب کہا تھا۔

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت وغم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

اس شعر کی تہہ میں اترنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شاد نے خود اپنے بارے میں جو رائے قائم کی ہے اسکی کاٹ ممکن نہیں۔ یہ ساری چیزیں ان کے زور کلام اور معاصرین کے درمیان طرز اسلوب کی انفرادیت کی وجہ سے ہے۔شاد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کا کلام مختلف شعراء کے رنگوں کا گلدستہ ہے۔اس کے باوجود ایک الگ طرح کی سحر کاری ہے۔ان کے کلام میں گاہِ بگاہِ آتش،انیس ایک طرف جہاں دکھائی دیتے ہیں تو دوسری طرف داغ اور غالب بھی صف میں ہیں۔حافظ،خسرو اور نظیر بھی ان کی محفل شعر خوانی میں شریک ہیں۔اس کے باوجود انکے کلام کا امتیازی رنگ اخلاقی اور مثبت زندگی گزارنے کا رویہ ہے۔مثال کے طور پر۔

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
لے کے خود پیر مغاں ہاتھ میں مینا آیا
مے کشو ! شرم کہ اس پر بھی نہ پینا آیا
شاد کچھ پوچھو نہ مجھ سے میرے دل کے داغ کو
ٹمٹما تا سا چراغ اک اپنے ویرانے میں تھا

کلیم الدین احمد نے شاد کے سلسلے میں بڑا صداقت آمیز جملہ لکھا ہے۔

''اردو غزل کے کائنات کی تثلیث میر، غالب اور شاد ہیں۔''

اردو شاعری میں شاد کے بعد جس اہم شاعر پر نظر پڑتی ہے وہ حسرت موہانی ہیں۔حسرت موہانی اردو غزل کو نہ صرف نیا رنگ بلکہ نئے لب و لہجے سے بھی مزین کیا ہے۔صنفی اعتبار سے غزل روایت کی پاسدار رہی ہے لیکن اس کی پاسداری میں بھی چند گنے چنے شعراء نے اپنے جگر کا لہو صرف کیا ہے۔حسرت بھی انہیں میں سے ایک ہیں۔ جدید غزل کی بات جب بھی آتی ہے تو اصول وضوابط کے معاملے میں حسرت موہانی

سب سے آگے نظر آتے ہیں۔ یہاں لفظ جدید کسی ازم یا تحریک سے متعلق نہیں ہے۔ حسرتؔ کی غزلوں میں نشاط عشق اور تغزل میں حسّیاتی خصوصیات نمایاں ہے۔ان کی غزلوں میں یہ دونوں کیفیات کچھ تو ان کی اپنی افتاد طبیعت اور کچھ زمانے کی عطا کردہ مکروہات دنیا سے عبارت ہے۔ان کے یہاں خارجیت اور داخلیت کا بڑا خوش گوار امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔مثال کے طور پر درج ذیل اشعار بطور دلیل پیش کئے جا سکتے ہیں۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے
چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اپنی عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

ان اشعار کی تہہ میں اترنے کے بعد ہم ایک دل پذیر شعریت کی راہ سے گزرتے ہیں۔حسرتؔ کے بعد یوں تو فانیؔ بھی دنیائے شاعری کو متاثر کرتے ہیں لیکن فانی کے یہاں عشق،تصوف اور اسرار کائنات مستقل موضوعات بن کر ابھرتے ہیں۔ فانیؔ کے یہاں ایک خود دار طبیعت شاعر ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔فانیؔ کا غم پوری کائنات میں بکھرا معلوم ہوتا ہے۔اور یہ کیوں نہ ہو کہ میرؔ کا سوز و گداز، غالبؔ کا تفکر دونوں ہی اجزاء ان کے یہاں شیر وشکر کی طرح گھل مل گئے ہیں۔انکے بعض اشعار زبان زد بھی ہیں۔جیسے۔

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہنچی تری جوانی تک
کوئی چٹکی سی کلیجے میں لئے جاتا ہے
ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے

ان کے شاعرانہ تشخص کے لئے یہی دو اشعار کافی ہو سکتے ہیں۔

دنیائے شاعری میں فراق گورکھپوری ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ فراق گورکھپوری نے اردو غزل کو ہندی الفاظ کے اشتراک سے درجہ کمال تک پہنچایا اور عشق کے اعلیٰ عرفان کو غزل کی زینت بنایا۔ فراق گورکھپوری نے اردو غزل کو نہ صرف بلندی عطا کی بلکہ یہ بھی ثابت کیا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فراق کی غزلوں پر میر، مصحفی اور غالب کا کافی اثر پایا جاتا ہے۔ سچائی بھی یہی ہے کہ محولہ تینوں شعراء کی شاعری کا جو نمایاں وصف ہے اس کو فراق نے بڑی فن کاری اور صنّاعی سے اردو غزل کے قالب میں ڈھال دیا۔ چونکہ فراق کا مطالعہ انگریزی، ہندی اور سنسکرت کا بھی تھا اس لئے انہوں نے مغربی علم و فن سے استفادہ کرتے ہوئے مشرقی شعریات کو برتنے میں خاص فنی چابکدستی کا مظاہرہ کیا۔ مثال کے طور پر درج ذیل اشعار انکی ذہنی کیفیت اور شاعرانہ عظمت کو بیان کرنے کے لئے کافی ہے۔

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں
ایک مدّت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں
تارے گن گن کے ہم نے کاٹی رات
تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی
ہم سے کیا ہو سکا محبت میں
خیر تم نے تو بے وفائی کی

ان کی غزلوں کے اشعار میں نغمگی اور غنائیت بھری پڑی ہے ضرورت اسے کریدنے کی ہے۔ فراق کی شاعری میں ہندوستانی روح اس طرح بھری ہوئی ہے جس

طرح فارسی شاعری میں ایرانیت۔فراقؔ کے بعد زمانی اعتبار سے فیض احمد فیضؔ ایک بلند مرتبت شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔فیض احمد فیضؔ بحیثیت ترقی پسند شاعر حوالے کے طور پر پیش کئے جاتے رہے ہیں۔ترقی پسندانہ شاعری کرنے والوں میں فیض احمد فیضؔ نے سب سے بڑا کام یہ کیا ہے کہ اردو غزل کو نعرے بازی سے آزاد کیا۔جن لوگوں نے ترقی پسندی کو محض نعرے بازی پر محمول کیا ہے اسے فیض احمد فیضؔ کی شاعری کا گہرائی سے مطالعہ کرنا چاہیئے۔فیض احمد فیضؔ اردو غزل کے ٹرینڈ سیٹر یعنی رجحان ساز شاعر ہیں۔فیضؔ ایسے مقام پر کھڑے ہیں جہاں ترقی پسندی کی انتہا پسندانہ آواز ان کا پیچھا کررہی ہے اور آگے جدیدیت کی صدائے دل پذیر بھی انکا خیر مقدم کرنے کیلئے دستِ مصافحہ بڑھا رہی ہے۔فیضؔ چونکہ نباض وقت رہے ہیں ساری زندگی جدوجہد میں گزری ہے وہ جانتے ہیں کہ ادب میں فن یعنی آرٹ اپنے وقت کو منعکس کرنے والا سچ ہوتا ہے۔فیضؔ کی شاعری میں ان کے عہد کا سچ بولتا ہے حق تو یہ ہے کہ انکی رومانیت میں بھی آزادی کا نغمہ جاری ہوتا ہے۔یہ اور بات ہے کہ اس نغمگی میں مدھم مدھم چیخ بھی سنائی دیتی ہے۔ان کے یہاں موضوعات کے چہرے مختلف ہیں۔انہوں نے روایتی غزل کو نئے سماجی شعور کے پس منظر میں سلیقے سے پیش کیا ہے۔مثال کے طور پر درج ذیل اشعار۔

مقام فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے
وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے
گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

فیضؔ نے ۱۹۸۴ء میں وفات پائی اس لحاظ سے دیکھا جائے تو فیضؔ جس شاعری کو پیش کر چکے تھے اس کو سنبھالا دینے والا تقریباً کوئی نہ تھا۔ ۱۹۶۰ء کے دہے میں ہی اردو ادب میں ایک خوشگوار جھونکے کی طرح جدیدیت کی لہر جسمِ غزل میں سما گئی۔ یہ آناً فاناً بھی نہیں ہوا کیونکہ کوئی بھی تحریک یا رجحان کے استحکام کے لئے ماضی، حال اور مستقبل تینوں طرح کے موافق صورتِ حال کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ فراقؔ، فیضؔ نے اردو غزل کو بھاری بھرکم شعری سرمایہ کا مالک بنایا تھا۔ اس کا احتساب کرنے کیلئے ایک ایسی بڑی شخصیت کی ضرورت تھی جو بہت دنوں تک عنقا رہی۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ فراقؔ، فیضؔ کے بعد اردو غزل بہت دنوں تک بے سروسامانی کا شکار رہی چونکہ ترقی پسندانہ شاعری ایک مخصوص تحریک سے متاثر رہی ہے۔ اس لئے اسکے سیاسی پس منظر پر بہت دنوں تک جوش وخروش کا ماحول قائم رہنے کے باوجود اردو غزل بے اعتنائی کا شکار ہوگئی۔ خیریت یہ گزری کہ جدیدیت کی لہر دو طریقے سے ہندوستان میں داخل ہوئی۔ ایک طرف مغرب کا سیاہ جھونکا جو اپنے اندر بے یقینی، ناامیدی، خوف، ڈر، ابہام، اہمال کو لئے ہوئے تھا دوسری طرف ہندوستان میں خود بدلتی ہوئی صورت حال اس کے لئے ذمہ دار تھی۔ یعنی غربت واخلاص، بے روزگاری، بے زاری، عوامی کرب اور سماجی سروکار پر فردیت پسندی کا غلبہ یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ خلط ملط ہو کر ایک دوسرے میں سما گئیں۔ ظاہر ہے کہ اردو شعروادب کا اس سے متاثر ہونا عین فطری امر تھا۔ ۱۹۶۰ء کے دہے میں جدیدیت کی باضابطہ تشریح شمس الرحمٰن فاروقی نے پیش کی اور شب خون' جیسے تاریخ اور عہد ساز رسالے کا اجرا کیا۔ اسی جدیدیت میں سارتر کے فلسفے وجودیت کی عملی تشریح اور خدا کی موت کے اعلان کی مغربی توضیح بہت دنوں تک فیشن زدہ جدیدیت کا غالب رجحان بنکر ہمارے سامنے آئی یعنی فردیت اور گمشدگی کے نوحے کو جدیدیت نے مربوط ڈھنگ سے پیش کرتے ہوئے ابہام و

ہمال کی ساری سرحدیں توڑ ڈالیں۔ الفاظ کی لذت کوشی اور سنجیدہ موضوعات مسخرے پن کے دائرے میں لا کر ایسے اشعار کہے جانے لگے۔ جس کو پڑھ کر اردو غزل کا ایک طبقہ اسی سے منحرف ہوتا چلا گیا۔ اردو غزل میں ایک طرح کی انارکی آ گئی۔ اسی بھیڑ چال میں کئی صالح طبیعت بھی گم ہو گئے۔ اسی دہے میں شمس الرحمٰن فاروقی کی ادارت میں الہٰ آباد سے 'شب خون' جاری ہوا۔ شمس الرحمٰن فاروقی امام جدیدیت قرار دیئے گئے۔ 'شب خون' کے صفحات ان شعراء کے لئے وقف کر دیئے گئے۔ جو پھوہڑ پن کی پیشکش میں آگے آنے کی کوشش کرتے رہے۔ چند ناموں میں محمّد علوی، عادل منصوری، ظفر اقبال تھے۔ جنہوں نے غزلوں میں مشترک موضوعات کو کھلے عام برتنے کی کامیاب کوششیں کیں۔ اخلاقیات کا دبیز پردہ ہٹتا گیا اور لوگ مسخرے پن پر اتر گئے۔ مثال کے طور پر۔

ہمسائے کے گھر ٹھہری ہے جو ایک قیامت
کچھ روز میرے گھر میں بھی مہمان رہے گی
(مظفر حنفی)

بکری میں میں کرتی ہے
بکرا زور لگاتا ہے
(ساحل احمد)

میں بدل سکتا جو بوسہ تو بدل ہی لیتا
یہی بہتر ہے کہ تو ہی کہیں رخسار بدل
(ظفر اقبال)

غزل میں ایک مخصوص قسم کے استہزائیہ پن کو فروغ دینے والوں میں بہت سے ایسے نام بھی تھے جنہوں نے بعد میں اپنی شاعری کی جہت ہی بدل دی۔ میں یہ

محسوس کرتا ہوں کہ زمانہ جدیدیت کے ابتدائی دور میں یہ پھکڑ پن کوئی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ یوں کہا جائے کہ ترقی پسندوں نے نعرے بازی سے غزل کی جس شاعرانہ فضا کو بوجھل کر دیا تھا اس سے نجات کی صورت یہی تھی کہ سب سے پہلے طبیعت ہلکی کی جائے۔اسے ادبی طور پر غم غلط کرنے کا ادبی بہانہ ہی کہنا چاہیئے۔اس ضمن میں اہم بات یہ ہے امام جدیدیت کہے جانے والے شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی غزلوں میں ایسی کوئی نشانی نہیں چھوڑی جس سے کہا جائے کہ مسخرہ پن پیش کرنے والوں کے یہ محرک رہے ہیں۔بانی، زیب غوری، کمار پاشی، مظفر حنفی، محمد علوی، شہریار، عادل منصوری، پرکاش فکری، سلطان اختر، زبیر رضوی، شکیب جلالی، ساقی فاروقی، بشیر بدر، راج نرئن راز، وہاب دانش، شمس الرحمٰن فاروقی، ندا فاضلی، مصور سبزواری، بشر نواز، غلام مرتضیٰ راہی، مظہر امام یہ چند کچھ ایسے نام ہیں جو جدیدیت کی اساسی پیداوار کہے جا سکتے ہیں۔ان کی تخلیقی آواز کا شہرہ اس لئے بھی نمایاں ہوا کہ شمس الرحمٰن فاروقی کا رسالہ 'شب خون' انہیں بڑھ چڑھ کر Promote کر رہا تھا۔مذکورہ شعراء کی شاعری کا اجمالی جائزہ اگر پیش کیا جائے تو ایک سو سے زائد صفحات درکار ہونگے اس لئے اب میں ان شعراء کے وہ نمائندہ اشعار درج کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔جو ان کی شاعری میں کلیدی طبیعت بن کر گونج رہی ہے۔

کردار قتل کرنے لگے لوگ یوں کہ ہم
اپنے ہی گھر میں بیٹھ کے آوارہ ہو گئے
(شمس الرحمٰن فاروقی)

گھر سے چلے تھے پوچھنے موسم کا حال چال
جھونکے ہوا کے بالوں میں چاندی پرو گئے
(ندا فاضلی)

خاموشیوں کی ریت سے یہ جھیل بھر گئی
اترے تھے کچھ پرندوہ جاتے ہیں لوٹ کر
(پرکاش فکری)

پیڑ سے پیڑ لگا رہتا ہے
پیار ہوتا ہے گھنے جنگل میں
زمین لوگوں سے ڈر گئی ہے
سمندروں میں اتر گئی ہے
(محمد علوی)

وقت کی ڈور کو تھامے رہے مضبوطی سے
اور جب چھوٹی تو افسوس بھی اس کا نہ ہوا
(شہریار)

شاید چھپا ہوا سا یہ نکل پڑے
اجڑے ہوئے بدن میں صدا تو لگایئے
(عادل منصوری)

عجیب شخص ہے ناراض ہو کے ہنستا ہے
میں چاہتا ہوں خفا ہو تو وہ خفا ہی لگے
(بشیر بدر)

آگے آگے کوئی مشعل سی لئے چلتا تھا
ہائے کیا نام تھا اس شخص کا پوچھا بھی نہیں
(شاذ تمکنت)

زندگی جن کی رفاقت پہ بہت نازاں تھی
ان سے بچھڑے تو کوئی آنکھ میں آنسو بھی نہیں
(زبیر رضوی)

ذرہ ذرہ تو سمیٹے ہوئے پھرتا ہے مرا
میں کہ اس ڈھیر میں خود آگ لگانا چاہوں
(مصور سبزواری)

شامل ہوں قافلے میں مگر سر میں دھند ہے
یعنی ہے ایک راہ جدا بھی مرے لئے
(باقیؔ)

جاتا نہیں کناروں سے آگے کسی کا دھیان
کب سے پکارتا ہوں یہاں ہوں یہاں ہوں میں
(عمیق حنفی)

محولہ جدید شعراء کے اشعار درج کرنے کے بعد اور ان اشعار کی داخلی پسِ منظر میں جھانکنے کی شعوری کوشش اس لئے بھی ضروری ہے کہ غلام مرتضٰی راہیؔ کی غزلیہ شاعری کا کلیدی رنگ دریافت کرنا مقصود ہے۔معاملہ ایسا ہے کہ غلام مرتضٰی راہیؔ اردو غزل کی روایت کے ایسے پاسداروں میں ہیں جن کی پہچان خود نئے کلاسک کی حیثیت سے بن گئی ہے۔ان کا براہ راست تعلق غزل کی روایت کے اس سرے سے ملتا ہے جہاں معنی آفرینی کیلئے رائج الوقت یا منتخبہ الفاظ کی مجبوری سامنے نہیں آتی ہے۔راہیؔ جدید لفظیات کے شاعر نہیں ہیں وہ درونِ معنی اتر کر مضمون تلاش کرنے والے شاعر ہیں۔نکتہ آفرینی فلسفیانہ موشگافیاں، اسلوب کی جدّت، مخاطبے میں اپنائیت، بیان کی سحر کاری سے ایک عرصے تک راہیؔ اردو غزل کے شائقین کو متاثر کرتے رہے ہیں۔

شعر میں ناخن چبھونے جیسی کیفیت جسے ہم نوکیلا پن سے موسوم کرتے ہیں یوں ہی طبیعت کے حصے میں نہیں آجاتی، اس کے لئے مدتوں غمِ دوراں کی تپش میں جھلنے کے بعد خود احتسابی کے عمل سے گذرنا پڑتا ہے۔ راہیؔ کے اب تک چھ شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں اور مرحلہ وار جس شدّت سے اپنی مخصوص وارداتِ قلبی کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں۔ اس سے یہ انکشاف کرنے میں آسانی ہوتی ہے کہ غالب کی نفسیات کو قریب تر کرنے والے شعراء میں انکا شمار ہونے لگا ہے۔۔۔۔۔۔ مثال کے طور پر راہیؔ کے درج ذیل اشعار نکتہ آفرینی، ارضیت پسندی کے لحاظ سے پیش کئے جاتے ہیں۔

سب ایک موڑ تک آئے مرے تعاقب میں
پھر اس کے بعد سمجھنے لگے سرابؔ مجھے
(راہی)

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کوؔ میں
(غالبؔ)

جو مرے واسطے دشوار نظر آتا ہو
مجھکو ایسی ہی کسی کام کے قابل کر دے
(راہی)

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں
(غالبؔ)

معاملہ ایسا ہے کہ جدید غزل کے بیشتر نمائندہ شعراء کا تعلق کسی نہ کسی طرح

غالبؔ سے ملتا ہے۔یعنی بقدر پیمانۂ تخئیل ہر شاعر اپنی ظرافت اور صلاحیت کے بل پر ہی غالبؔ کی شاعری سے معاملۂ عشق طئے کرتا ہے۔بانیؔ کو ہی لے لیجئے کئی معاملے میں وہ غالبؔ کی گہرائی و گیرائی کو ناپتے اور چھوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔مثال کے طور پر بانیؔ کا یہ شعر۔

شامل ہوں قافلے میں مگر سر میں دھند ہے
یعنی ہے ایک راہ جدا بھی مرے لئے

موضوع شعر میں لاکھ جدّت سہی لیکن وہ غالبؔ کے انداز کا تتبع کرتے نظر آتے ہیں۔مصور سبزواری ہوں یا زیب غوری معنوی،صوتی خوش آہنگی کے معاملے میں غالبؔ کے شعر کی ہیئت کو وجود میں لانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔مظفر حنفی کی ایسی غزلوں کے متعدد اشعار ذہن میں رکھیئے جس میں شوخی اور ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہو۔غالبؔ کے طنز کا نشتر معلوم ہوتے ہیں۔جو دل اور دماغ میں یکساں طور پر چبھتے ہیں۔اس لحاظ سے غلام مرتضیٰ راہیؔ کے بیان میں غالبؔ کی شعری نفسیات کو برتنے کا تخلیقی ہنر ان کے معاصرین کی صف میں لاکر کھڑا کرتا ہے جو غالبؔ جیسے مشکل پسند شاعر کی شعری صحبت میں بیٹھنا شان اور فخر سمجھتے ہیں۔ہر چند کہ راہی کے یہاں بھاری بھرکم شعری تلازمے نہیں گڑھے گئے ہیں۔دوراز کار تشبیہات پیش نہیں کی گئی ہیں۔نادر تراکیب کی مصنوعی کوشش سے بچتے ہوئے ایسے حربے استعمال نہیں کیۓ گئے ہیں جس سے فیشن زدہ ہونے کا ان پر لیبل لگے اس کے باوجود یہ بہت اہم بات ہے کہ راہی کی جدید غزلوں کا ایک وافر حصہ تنگ دامانیٔ خیال کی نذر نہیں ہوا ہے بلکہ اور بھی موجِ طبع کی روانی میں سرعت آئی ہے۔راہیؔ کے کلام کا سب سے نمایاں وصف اضافتی ترکیب کی بھاری بھرکم اصطلاح سے شعوری طور پر بچنا ہے۔یہی وہ نکتہ ہے کہ وہ اثر آفرینی میں غالبؔ سے رشتہ استوار کرنے میں کامیاب ہیں۔اور معاصرین کی ذہنی

سطح سے بھی بالاتر دکھائی دیتے ہیں۔بعض اہم مضامین کو غزل میں باندھنے کا سلیقہ انہیں مصور سبزواری کے قریب کرتا ہے۔رونق شہری نے اپنے ایک مضمون میں اسی ذہنی یکسانیت پر تفصیل سے لکھتے ہوئے کہا ہے کہ دونوں شعراء کے یہاں بعض مضامین یکساں ہونے کے باوجود انداز پیشکش میں امتیاز برقرار ہے۔

مری شکست پہ اس نے بھی توڑ دی تلوار
اسے بھی عظمتِ دشمن کا اعتراف رہا

(مصور سبزواری)

اک سنگ نامراد کا ہوتا ہے اس پہ شک
دریاؤں کو بھی پی کے وہ بادل نہیں رہا

(مصور سبزواری)

اگلا سا مجھ میں شوق شہادت نہیں اگر
پہلی سی کاٹ بھی تری تلوار میں نہیں

(راہی)

مل کے آپس میں پی گئے ہوں گے
دو کناروں میں ایک دریا تھا

(راہی)

اس حوالے کے علاوہ بھی بہت سارے نکتے ایسے ہیں جہاں راہی اہم جدید غزل گو کی حیثیت سے ہمارے سامنے لائق وفائق ٹھہرتے ہیں۔

****

باب نمبر۴۔

جدّت اور جدیدیت کا موجودہ تصور
غلام مرتضیٰ راہیؔ کی غزلوں کے تناظر میں

جدّت اور جدیدیت دونوں ملتے جلتے الفاظ ہیں۔غزل کا ایک عام قاری بھی ان دونوں Terms کی کوئی واضح تفریق اپنے ذہن میں نہیں رکھتا۔اس سے مغالطہ پیدا ہو جانا بھی اس لئے ضروری ہے کہ غزل کی تقسیم زمانہ وار جس مفہوم و معنی کے پس منظر میں ہوئی وہ روایت، ترقی پسندی اور جدیدیت کو پیش نگاہ رکھ کر ہوئی۔

روایت کے سلسلے میں ہماری آگہی یہ ہے کہ ہم داغؔ، رسواؔ، مومنؔ، آتشؔ، حسرتؔ، سراجؔ اورنگ آبادی، ولیؔ، میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ کے ورثے کے مالک ہیں۔ اس قدیم عمارت کے رنگ وروغن میں ترقی پسندوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔جوشؔ، جگرؔ، فیضؔ، سلیمان اریب وغیرہم نے ترقی پسندانہ شاعری سے اردو غزل کے وقار میں ایک طرف جہاں اضافہ کیا وہیں اسلوب میں جدّت کی دھمک فیضؔ کے کلام ہی سے شروع ہوگئی تھی۔ بقول شمیم حنفی

''ترقی پسند تحریک کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ماضی کے ہر ایک سالک کو رسم وراہ سے خبر دار سمجھ کر اس کی ہدایت پر سجّادے کو شراب میں ڈبو دینے سے باز رہنے کا درس دیا۔سوداؔ، میرؔ، نظیرؔ، انیسؔ، حالیؔ، اقبالؔ کی قدر و قیمت کے اعتراف کے علاوہ بعض ترقی پسند شعراء نے اپنی بساط کے مطابق ان کے اثرات بھی قبول کئے لیکن دشواری یہ تھی کہ ترقی پسندی کی ادّعائیت اور مخصوص نظامِ فکر میں اس کا

ایقان اخذ و استفادے کے کسی بھی عمل میں اپنے ذہنی تحفظات سے الگ نہ ہوسکا۔اس لئے ترقی پسند شعراء کا رشتہ اپنی روایت سے حقیقی نہیں بلکہ مصنوعی ہے'' ا؎

محولہ بالا سطور اخذ کرنے کی غرض و غایت یہ ہے کہ ترقی پسندوں نے روایت کے برخلاف کون سی انقلابی تبدیلی غزل کے فکری نظام میں لائی یا پھر اس کی ہیئت اور اسلوب میں تغیرات وتبدل کے کارنامے انجام دیئے۔شمیم حنفی کا بھی اپنا نظریہ ترقی پسند ہوسکتا ہے۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ غزل کے پارکھ اور ناقد کی حیثیت سے انکا اندازِ نظر غلط نہیں ہو لیکن یہ سرے سے کہنا کہ ان کا روایت سے رشتہ مصنوعی ہے گمراہ کن ہی کہا جاسکتا ہے۔غزل کے باب میں جب بھی انقلابی پیش رفت کی بات آئیگی فکری سطح پر ترقی پسندوں کی دین سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔انہوں نے غزل کی بنیادی طور پر فکری نظام میں جدّت کی راہ ہموار کی۔اس میں جو مضامین نظم کئے گئے ہیں روایت سے یکسر مختلف تھے۔گل وبلبل، چمن، قفس کی نئی تشریح ترقی پسندوں نے پیش کی۔آنچل کو پرچم بنا لینے کا درس دینے والے ترقی پسندوں نے کمال یہ بھی دکھایا کہ تقسیم ملک اور قومی یکجہتی کا نعرہ سب سے پہلے انہوں نے ہی پیش کیا اس لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ غزل کے اسلوب و فکر میں تازگی اور جدّت کا مظاہرہ یہیں سے شروع ہوا۔مثال کے طور پر فیضؔ کا یہ شعر ؎

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

درج بالا شعر کا جو شعری پس منظر ہے اس سے پہلے روایتی شاعری میں مفقود ہے۔

یہاں نئی غزل کے تعلق سے عہدِ حاضر کے اہم نقاد ڈاکٹر وہاب اشرفی کے نظریئے کو قلمبند کرنا ضروری ہوگا۔انکا کہنا ہے کہ

''کیا ایسا نہیں ہے کہ جدید یا جدید تر غزل نے اس روایت کی توسیع کی ہے

ا؎ غزل کا نیا منظر نامہ۔شمیم حنفی

جو ترقی پسندوں کا حصہ تھی۔ کہہ سکتے ہیں کہ فکری اور معنوی سطح پر ترقی پسند ایک Sanctity کی منزل پر پہنچ چکے تھے۔ان کے الفاظ کے دروبست تکرار کے باعث اپنی معنویت کھونے لگے تھے یہ تکرار لفظی سطح پر بھی تھی اور فکری سطح پر بھی ۔لہٰذا اس حد سے دوسرے شاعروں کو آگے جانا ہی تھا ورنہ انکا تخلیقی سوتا خشک ہو جاتا اور نئے شعری رویئے کی صورت ہی نہیں نکلتی ۔خیر سے زندگی کے نئے مطالبات سامنے تھے یہ مطالبے فکری سطح کے بھی تھے اور تجرباتی حیثیت کے بھی ۔ایسے میں نئے سانچے کی تلاش ایک لازمی نتیجہ تھی ۔لیکن غزل کا سانچہ تو 'Fix' تھا۔اب دو صورتیں ممکن تھیں ۔ایک یہ کہ شاعر غزلوں میں ان ہی استعاروں، پیکروں اور علامتوں سے کام لے جو ترقی پسندوں کے لئے مخصوص تھے یا ماضی کی طرح لوٹ جائے جہاں پہلے ہی سے یہ تمام شعری صورتیں اپنا دم خم Exploit کر چکی تھیں ۔نئے شاعروں کے لئے ظاہر ہے یہ کوئی مستحسن چیز نہ ہوتی ۔ یہ بھی تھا کہ نئے شاعروں کے اپنے غم تھے، اپنی آرزوئیں تھیں، اپنے کو پہچاننے کا بھی عمل تھا اور زمانے نے انہیں جو کچھ دیا تھا اسے آئینہ بھی کرنا تھا۔ رشتے ناتوں کی وہ کیفیت باقی نہیں رہی تھی جو کبھی صالح قدر کی حیثیت رکھتی تھی۔ اجتماعی منظر نامہ بے کیف ہو چکا تھا۔معاشی ،معاشرتی ،ثقافتی اور تمدنی حقائق بدل چکے تھے۔ صنعتی اور مشینی دور نے مثبت قدروں کو پامال کر رکھا تھا۔Urbanization کا عمل تیز ہو چکا تھا۔وقت کی رفتار وہ نہیں تھی جو پہلے تھی ۔ان سب کا نتیجہ یہ تھا کہ شاعر فکر کے اعتبار سے بھی الگ ہو اور اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے کے لئے لفظوں کو ایک بار پھر نئی معنویت سے ہمکنار کرے۔نئی غزل ان ہی امور سے عبارت ہے۔'' [1]

ڈاکٹر وہاب اشرفی نے جدید غزل کو ترقی پسند روایت کی توسیع قرار دیا ہے۔ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اس کے تقاضوں میں بھی تبدیلی آئی اس لئے فکری نظریات

---

[1] آگہی کا منظر نامہ۔ڈاکٹر وہاب اشرفی

بھی بدلے۔ظاہر ہے شاعری اس سے دور کیسے رہ سکتی تھی اسی فکری بدلاؤ نے جدید غزل کی بنیاد ڈالی۔میری نظر میں جدّت غزل کی ہیئت، فارم، مضمون آفرینی سے تغیّر کی فضا تخلیق کرنے کا نام ہے۔جدّت سے مراد روایتی طرز فکر سے فطری طور پر شعور کو الگ رکھتے ہوئے غزل کے بنیادی فکری ڈھانچے یا نظام میں تبدیلی لانے سے ہے۔جدّت روایتی شاعری کے اہم شعراء میں بھی پیش کئے جاتے رہے ہیں۔ظاہر ہے کہ فکری نظام ہی اس کا محور قرار دیا جا سکتا ہے۔مومنؔ، میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ جیسے غزل کے چار شہر یارانِ غزل کی جدّت اسلوب کے ساتھ ساتھ فکری تعمق کی انفرادیت برقرار ہے۔مثال کے طور پر۔

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو
(مومنؔ)

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے
(میرؔ)

دھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن
(غالبؔ)

وہ اک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات
(اقبالؔ)

فکری نظام کے حوالے سے محولہ شعراء کے اشعار کا بہ نظر غائر مطالعہ ہم کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مضمون آفرینی کے ساتھ ساتھ انداز پیشکش بھی دلفریب

ہے۔مضمون کو سلیقے سے باندھنے میں جدّت طرازی کا یہ ہنر نہ تو ورثے میں روایتی شعراء سے انہیں دستیاب ہوا ہے اور نہ کوئی الہامی صورت حال اس کے لئے ذمہ دار رہی ہے۔ان سطور کو لکھنے کی غرض یہ ہے کہ جدّت طرازی کی کئی شکلیں جو علامتی، استعاراتی اور فکری نظام نیز صوتی خوش آہنگی کی فنکارانہ پیشکش بھی جدّت پسندی کے دائرے میں آسکتی ہے۔جدّت کی Modernity اور جدیدیت کی Modernism کی ادبی اصطلاح چند لفظوں میں اس طرح پیش کی جاسکتی ہے کہ جدّت ہیئت وفکر میں انفرادی شان پیدا کرتی ہے جبکہ جدیدیت ایک خاص فکری اور زمانی نظام کے تابع ہو کر تخلیق ہونے والی شاعری ہے۔یہ غزل سے بھی متعلق ہے نظم سے بھی اور نثر کی دوسری اصناف سے بھی علاقہ رکھتی ہے۔مغرب سے چل کر آئی جدیدیت کی لہر ہندوستان میں اس طرح پرورش نہیں پا سکی جیسا کہ وہاں۔لیکن بطور فیشن زدگی اردو غزل کے نام نہاد ایسے سینکڑوں شعراء نے اس میں ڈبکی لگائی۔کچھ تو اس میں ڈوب گئے اور کچھ جو بچے وہ تلخ تجربہ حاصل کر کے ٹھہری ہوئی آندھی کا انتظار کرنے لگے۔جدیدیت کی بنیادی فلسفیانہ اساس میں فردیت پسندی کا بڑا رول رہا ہے۔انسان کی شکستہ حال زندگی کو سماجی نظریہ ساز ادیبوں کی پول کھولنے کی شعوری کوشش میں بہترے جدیدیئے کامیاب رہے۔خصوصاً غزل میں بنیادی طور پر جن شعراء نے ہندوستان میں فرد کے دُکھ کو منور کیا ہے ان میں باؔنی، کمار پاشی، سیّد امین اشرف، محمد علوی، عادل منصوری، راج نارائن راز، مصور سبزواری، مظفر حنفی، مظہر امام، پرکاش فکری، زیب غوری، سلطان اختر کچھ ایسے ہی نام ذہن میں موجود ہیں جن کے اشعار کی روشنی میں جدیدیت کی واضح صورت حال کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

دکھا کے لمحۂ خالی کا عکس لا تفسیر
یہ مجھ میں کون ہے مجھ سے فرار کرتے ہوئے
(باؔنی)

یہ کیسی آگ برستی ہے آسمانوں سے
پرندے لوٹ کے آنے لگے اُڑانوں سے
(کمار پاشی)

طے کر رہا ہوں خواب و حقیقت کے فاصلے
مانا کہ میں کہاں تری آوازِ پا کہاں
(سید امین اشرف)

چڑیوں کی آرزو میں
زخمی شجر رہے ہیں
(محمد علوی)

پھر بعد میں وہ قتل بھی کر دے تو حرج کیا
لیکن وہ پہلے پیار بھی کرتا ہوا سا ہو
(عادل منصوری)

آنکھ میں نشۂ مسلسل نئے آفاق کا ہے
کیا قیامت کہ ہمیں دامنِ خالی ٹھہرے
(راج نرائن راز)

سورج کے رتھ کو اندر لانا چاہوں
کھڑکی روشن دان ہیں بے حد تنگ مرے
(مصور سبزواری)

وہاں ملا بھی تو اپنا ہی آشنا سایہ
کھڑے تھے دیر سے ہم روشنی کے رستے میں
(مظہر امام)

تاریک پربتوں میں سورج نے جان دیدی
ٹھنڈا اُداس کہرا بستی پہ ڈولتا ہے
(پرکاش فکری)

نہ جانے شاخِ تعلق سے کب گروں کٹ کر
پھر اس کے بعد تو میں ہوں گا اور ہوا ہوگی
(زیب غوری)

دیکھ کر ان کو لرز جاتی ہے ہر موجِ بلا
اپنی کشتی میں جو گرداب لئے پھرتے ہیں
(سلطان اختر)

مذکورہ شعراء کے فکری نظام اور اسلوبیاتی پیشکش کی سطح پر جب ہم غلام مرتضیٰ راہیؔ کے کلام کی خصوصیات، اس کے مبادیات، اسلوب اور ندرتِ پیشکش پر دھیان مرکوز کرتے ہیں تو یہ نتیجہ اخذ کرنے میں آسانی ہوتی ہے کہ وہ ایک صالح طبیعت شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کے کلام میں نہ کسی فیشن زدہ شاعر کی بازگشت ہے اور نہ تقلیدی روش کو فروغ دینے کی شعوری لاشعوری کوشش ہے۔ یعنی غلام مرتضیٰ راہیؔ کی شاعری کا خاصہ یہ ہے کہ انکے مبادیات شاعری میں غزل کی روایت کا حُسن خوش شکل جدیدیت کو صورت گری عطا کرنے میں معاون رہا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ غلام مرتضیٰ راہیؔ ایک ایسے جدید شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں جس سے ان کی روایت کے تیئں پاسداری ترقی پسند شاعری کے عمیق مطالعے کے باوصف زینہ بہ زینہ جدیدیت کی عمارت کی تزئین کاری میں شروع سے ہی پیش پیش رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے درج ذیل اشعار میرے اس دعوے کو مصدقہ کرنے کے لئے کافی ہیں۔

جو ہے در پردۂ ابہام وہ محشر نہ اٹھا
رخِ مفہوم سے الفاظ کی چادر نہ اٹھا
(تراکیب کی جدّت)

اٹھی ہے گرد تو اب انتظار کر ہی لیں
نجانے کون ہمارے قریب آتا ہے
(گمانِ وجود)

سمندر سمندر کھنگالو اُسے
کہ قطرہ گہر ہونے والوں میں تھا
(مضمون آفرینی، رمزیت)

تو مرے چاک پیرہن پہ نہ جا
باوجود اس کے دم گھٹا جائے
(روایت کی پاسداری)

حصار کھینچ دیا میں نے اپنے چاروں طرف
کہ مجھ سے بے سروسامانیاں چھپاتے بنے
(خودحفاظتی)

پھر مجھ کو لے چلا سوئے مقتل مرا ضمیر
پھر مجھ سے کوئی فعل خلافِ انا ہو
(ضمیر، انا کا تصادم)

جھپک گئی تھی گھڑی دو گھڑی کو آنکھ کہیں
سفر ہمارا اسی درمیان ختم ہوا
(احساس رائیگانی)

احسان لے کے بیٹھ گیا ہے کوئی غریب
کیا میرا کام آنا کچھ اچھا نہیں ہوا
(بے مصرف لمحے)

نذرانہ مال وزر کا لئے جا رہے تھے سب
میں سر کو اپنے کاٹ کے بے کار لے گیا
(انتہائے خلوص)

درج بالا اشعار میں مضمون باندھنے کی جدّت موجود ہے۔نفس مضمون کو اپنے اسلوب میں ظاہر کرنے کیلئے راہیؔ نے کوئی مصنوعی طریقۂ کار ایجاد نہیں کیا کہ اس میں خواہ مخواہ کی جدّت پیدا ہو،لیکن تراکیب،تشبیہہ استعارے اتنے صاف وشفاف کہ ان کی ہنر کاری کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔اب میں راہیؔ کے ان اشعار کی طرف آتا ہوں جس میں جدیدیت موجود ہے۔اس اشعار میں شکست ذات کا نوحہ اور اس کے اسباب وعلل کا سراغ بھی سلیقے سے پیش کیا ہوا ہے۔جس سے صالح جدیدیت کے علمبردار کی حیثیت سے غلام مرتضٰی راہیؔ کی حیثیت کو تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

آج اس کے چلے جانے کے افسوس میں شامل
کل اپنے نہ رہنے کا بھی غم کرتا چلا جاؤں
شفق کا نظارہ جنہیں دیکھنا ہو
ہماری سحر شام میں ڈھل رہی ہے
اب کے اک ایسی ہی ٹھوکر سے مرا سامنا ہے
جو سنبھالے گا مجھے وہ بھی سنبھلنے کا نہیں
یہ اندھیرا جو ہے چراغ تلے
کیسے آئے کوئی قریب مرے

جیسے کوئی کاٹ رہا ہے حال مرا
جیسے اُڑنے والا کوئی پرندہ ہے
جو لگ رہی ہیں تمہیں آسمان چھوتی ہوئی
ہم ان عمارتوں کا بوجھ ڈھوئے بیٹھے ہیں
خود کو کبھی آئینے میں دیکھا بھی نہیں تھا
جب دیکھنا چاہا تو وہ چہرہ بھی نہیں تھا
بن کر مرا رگ رگ میں ابھی دوڑنے لگ جائے
بہتا ہے وہی خون تو میرا نہیں لگتا
نیند میں پاؤ گے ہمیں اُٹھ کر
صبح تک ہے ہماری بیداری
اکیلا کہیں تم کو پایا نہیں
کہ یک لخت دنیا تمہاری ہوئی
ہوتا ہے میرے جیسا سپاہی کوئی کوئی
اپنے خلاف تجربہ ہے مجھ کو جنگ کا
میرے جینے کے وسیلوں میں کوئی
موت کا میری سبب ہو جائے گا
تمہاری دوریاں مٹنے کو ہیں راہیؔ
مصور، زیب ، عرفان اور بانی سے

ان اشعار کی نقل کے بعد انفرادی طور پر ہر شعر کی نفسیات کا مطالعہ اگر ہم کرتے ہیں تو راہیؔ کے یہاں جدیدیت کے غالب رجحانات میں تحیّر، واحد متکلم اور فردیت پسندی کے عناصر جابجا بکھرے دکھائی دیتے ہیں۔جدیدیت کے آغاز میں لا

یعنیت، علامت پسندی کی جو مصنوعی کیفیت طاری کرنے کی کوشش کی گئی تھی اسے شعوری طور پر پرہیز کرنے کا جو انداز راہی کے معتدبہ اشعار میں ملتے ہیں وہ نہ صرف مستحسن ہیں بلکہ حوالے کے اعتبار سے بھی کارآمد ہیں۔ سب سے بڑی بات انکی جدید شاعری کے سلسلے میں یہ کہی جاسکتی ہے کہ جدیدیت کے یک رخے پن یعنی منفی پہلو کا ان کے یہاں دور دور تک نشان دکھائی نہیں دیتا ہے۔ زندگی کے مثبت پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہوئے واقعات و سانحات کی لرزہ خیزی بیان کرنے میں باؔنی، مصور سبزوارؔی، پرکاش فکرؔی، ظفر اقبال، زیب غوری، مظفر حنفی سے مماثلت کا کوئی جواز فراہم نہیں کرتے۔ ان کا ذاتی کرب مشاہدے کی گھلاوٹ سے ایک خوش شکل جدید ہیئت کی تشکیل کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس طرح راہی ایک منفرد جدید شاعر قرار دیئے جاتے ہیں۔

''جدیدیت کی جمالیات'' لطف الرحمٰن کی ایک ایسی تنقیدی کتاب ہے جس میں Austhetic Sense in mordenism کا بھرپور مظاہرہ کیا گیا ہے بقول لطف الرحمٰن۔

''جدیدیت اور جدید حسیت مترادف اصطلاحیں نہیں ہیں لیکن دونوں کے درمیان بنیادی تضادات و اختلاف کی جستجو تحصیل حاصل ہے جدید حسیت کے نمایاں اور غالب میلانات جدیدیت کی جمالیات کا تعین کرتے ہیں۔ جدیدیت کے زمانی حدود کا تعین عصری احساس و شعور پر مبنی ہے۔ بہ الفاظ دیگر عصری تاریخ کی پیش قدمی اور رفتار و کردار سے جدیدیت کا بڑا گہرا تعلق ہے۔'' [1]

''جدیدیت کی جمالیات'' کی افادیت اس لئے بھی مسلّم ہے کہ جدیدیت کا جو تصور لطف الرحمٰن نے پیش کیا ہے وہ جمالیات کی روایتی اور فکری اصطلاحات سے قطع نظر Uptodate اور اہم نظریہ ساز فلسفیوں کے حوالے سے پیش کی گئی ہے۔ انہوں

---

[1] جدیدیت کی جمالیات۔ لطف الرحمٰن

نے جدید حسیت کے نمایاں اور غالب میلانات جدیدیت کی جمالیات کو واضح کرتے ہوئے عصری حسیت سے مملو اشعار پیش کیے ہیں جو کم و بیش سبھی معاصر شعرا کا احاطہ کرتے ہیں۔ مجھے اس بحث میں نہیں جانا ہے کہ غلام مرتضیٰ راہیؔ کے اشعار اس باب میں درج ہیں کہ نہیں۔ لیکن جیسا کہ عنوان ہے اس کی بھرپور عکاسی کرنے والے اشعار کی کمی غلام مرتضیٰ راہیؔ کے یہاں نہیں ہے۔

نئی غزل کے قارئین اور ناقدین اس نکتے پر اتفاق کرتے ہیں کہ عصری حسیت اپنے آپ میں جدیدیت کی جمالیات کا ایک حصہ ہے۔ عصری حسیت کی تعریف چند لفظوں میں یوں کی جاسکتی ہے کہ ماضی کے ذریعہ عطا کردہ رُطب و یابِس حال کے دامن میں کتنا ہے اور حال موجودہ پسِ منظر میں ٹریجڈی کامیڈی کے مبادیات کو کس حد تک میزانِ ظرافت میں رکھ کر تول رہا ہے۔ پھر مستقبل کی خوش آئند تصویر کیسی بن رہی ہے۔ ان تین کوائف پر اگر شاعر نظر رکھتا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ عصری حسیت کو اپنی شاعری میں نہ برت سکے لیکن اس کے قبل یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ تینوں ادوار کے اثرات کو وہ اپنی ذات سے کیسے وابستہ کرتا ہے۔

غلام مرتضیٰ راہیؔ کی غزلیہ شاعری کے حوالے سے اگر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ جدید کی جمالیات کی اکثر شرائط پوری کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم انکے درج ذیل اشعار پیش کرتے ہوئے ان کی تشریح کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

دکھائی دیتا نہیں دور دور تک لیکن
کوئی اشارے سے جیسے ہمیں بلاتا ہو

نئی غزل میں اشارے کنائے سے بات کرنے کا ہنر بانیؔ، زیب غوریؔ، اور پرکاش فکری کے علاوہ غلام مرتضیٰ راہیؔ کے یہاں بھی موجود ہے۔ یہ ایک شعری حسن ہے محرک کا دور دور تک پتہ نہیں چلتا پھر بھی حس کی ایک آنکھ اس معدوم وجود کی مسلسل

موجودگی پر اصرار کرتی ہے۔محولہ شعر اس پس منظر کو خوبصورتی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

شعر میں گہرائی و گیرائی ایک مستقل خصوصیت کے زمرے میں آتی ہے۔ اردو شاعری میں کم پانی میں تیرنے والے لوگ بھی موجود ہیں اور غواصی کر کے درِّ نایاب نکالنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ گہرائی کی بھی اہمیت ہے جس میں کہ پھیلاؤ یعنی گیرائی ہو۔اس زاویئے سے ہم دیکھتے ہیں تو غلام مرتضٰی راہی کا یہ شعر خشک موضوع بن کر بھی پُر لطف شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔

قیاس ہے کہ تہہ سنگ جوئے شیر ہوں میں
مری تلاش پہ مامور کوہ کن ہیں بہت

میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ راہی کے یہاں معمولی پن کو غیر معمولی بنا دینے کا ہنر ان کی مرصع ساز طبیعت کی دین ہے۔ یہ کاریگریٔ ہنر یوں ہی نہیں آتی۔مشاہدے کی آنکھ شئیِ خاص سے مکالمہ کرتی ہے، اس کا ردِّ عمل ہوتا ہے اور تب اخیر میں سود مند نتیجہ سے بہرہ مند ہونے کی توفیق حاصل ہوتی ہے۔ راہی ان منازل سے بے حد کامیابی اور خوبصورتی سے گزرے ہیں۔

ہمارے ہاتھ کی کاریگری نہیں لیکن
ہمارے نام کے پتھر عمارتوں میں ہیں

منزل کے نشاں کا سراغ لگانا ہو یا پھر اپنے وجود کی تلاش ہو کامرانی اور رائیگانی دونوں ہی آپ کے منتظر ہیں۔ یہ توفیق بھی اگر شاعر کو حاصل ہو کہ وہ اپنے ہونے کا جواز فراہم کردے تو بات بن جاتی ہے۔

کچھ تمہارا پتہ نشاں تو ملے
اپنی اپنی جگہ سے دھول اُڑا

شاعری میں بردباری اور خاکساری پیش کرنے کا طریقۂ کار مختلف شاعروں

کے یہاں الگ الگ ہے۔ یہ اس کے ظرف پر منحصر کرتا ہے کہ وہ اپنے ہی جملوں سے کتنا مجروح ہو رہا ہے یا پھر سامنے کے فریقِ مخالف کا کس حد تک نشانہ بن رہا ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں اسے اپنی عزت و حرمت بچائے رکھنی پڑتی ہے اس سے نہ غیرت مجروح ہوتی ہے اور نہ شیشۂ انا پارہ پارہ ہوتا ہے۔ اسی بات کو غلام مرتضیٰ راہی نے شعر کی زبان عطا کی۔

مری بساط ہی کیا ہے مگر نہ جانے کیوں
وہ معرکہ کی طرح کر رہا ہے سر مجھ کو

قدرتی مناظر کی منظر کشی جدید شاعری کی جمالیات کی ایک جہت رہی ہے۔ پیڑ، ندی، پہاڑ، ہوا، سمندر اس روئے زمین پر انسانی آبادی سے پہلے سے آباد ہیں انکی موجودگی سے ہم اپنی زندگی کی بھی توثیق کرتے ہیں۔ پیڑ بھی ہنستے ہیں، روتے ہیں، اُجڑتے ہیں اور بستے ہیں۔ لیکن ان کی اذیت ناکی کا درد اگر انسانی ذات سے متقابل ہو کر سامنے آئے تو شاعر کی ذکی الحسی ہی کہی جائیگی۔ غلام مرتضیٰ راہی نے قدرت کی عطا کردہ فیاضیوں میں (جن میں قدرتی مناظر بھی ہیں) ان سے براہ راست تعلق قائم کرتے ہیں۔ ان کا تعلق احساس کی سطح پر ہے۔ اس لئے شعر میں میکانیکی انداز نہیں بلکہ فطری طریقۂ کار ابھرتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر

اتر کے رہ گیا ہو جیسے کوئی خنجر سا
کھڑا ہے دشت کے پہلو میں اک شجر ایسا

اس ضمن میں مصور سبزواری نے بھی ایک شعر کہا تھا اس کا ایک مصرعہ یوں ہے

اشجار ہیں زمیں پہ کہ نیزے گڑے ہوئے

لیکن غلام مرتضیٰ راہی نے اس نوع کے مضمون میں جمالیاتی پہلو کو بہ انداز دیگر سامنے رکھا ہے پہلے مصرعہ میں "اُتر کے رہ گیا ہو" کا ٹکڑا بے حد با معنی ہے اور پھر اسے بطور خنجر

استعمال کر کے چھپا ہوا نہ دکھا کر ''اُتر کے رہ گیا ہو'' کہا گیا ہے جس سے معاملے کی ہیبت ناکی کا اندازہ ہوتا ہے۔دوسرے مصرعے میں ''دشت کے پہلو'' کاٹکڑا بھی کم بلیغ نہیں ہے۔اسے انسانی قدروں کے ساتھ منسلک کر کے بے حد موثر بنا دیا گیا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ راہیؔ کے کلام میں پیش کش کی خوبصورتی (جمالیات) اکہرا پن لئے ہوئے نہیں ہے بلکہ ہمہ جہت ہے، جس سے شاعر کے عمیق مشاہدہ پر دلالت ہوتی ہے کہ شعر کہنے والا بے حد ذکی الحس ہے۔

سنگ ملامت پھینکنے اور بدلے میں ردّعمل کا انتظا کرنے کی انسانی کمزوری پر سے پردہ اُٹھانا آسان نہیں ہے۔ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں وہاں سبھی فرشتے ہیں۔اس کارخانۂ قدرت میں بھانت بھانت کے لوگ سرد وگرم طبیعت کے مالک اور مختلف افکار و خیالات کے حامیان رہتے ہیں۔ غلام مرتضیٰ راہیؔ بھی چونکہ اسی معاشرے کی پیداوار ہیں اس لئے کہیں کہیں ان کا شعور واحساس ٹکراتا ہےاور پاش پاش ہوکرخود ان کے پاس مہذب شکل میں واپس آتا ہے۔وہ شکل چہرۂ شعر بھی ہوتی ہے۔اس ضمن میں ہی ایک جدید شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

نہیں ہے سنگ ملامت بقدر ظرف تو کیا
سنبھال اتنا ہی جتنا بدن پہ آتا ہے

یہاں شاعر نے سنگ ملامت کہہ کر حسن سلوک کے معیار کی شناخت کر لی ہے لیکن راہیؔ نے پھول اور پتھر کے امتیاز کو ختم کرتے ہوئے جو بھی شئے ان پر پھینکی گئی ہے اسے سلیقے سے واپس کرنے کا اہتمام کر دیا ہے۔اس شعر میں حسن سلوک کا جارح کی نکتہ چینی پر زیادہ منحصر کرتا ہے۔

پتہ نہیں کہ وہ پتھر تھا ، پھول تھا کیا تھا
جدھر سے آیا تھا میں نے اُدھر اُچھال دیا

جدید شاعری کی خوبصورتی میں تشکیک نے اہم رول نبھایا تھا۔ معاملاتِ زندگی میں شروع سے ہی ایک مہذب آدمی دھوکے کا شکار ہوتا رہا ہے۔ روایتی شاعری میں اسی لئے معشوق کی بے وفائی اور دغا بازی کی کثرت سے موضوعات ملتے ہیں اس میں بلا کی شوخی اور ظرافت کے نمونے بھی بکھرے ملتے ہیں۔ بشیر بدر نے تو بے وفائی کو ایک قدر مخصوص سمجھکر جدید شاعری میں برتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر۔

کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی
یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا

غلام مرتضٰی راہی کا اس ضمن میں رویہ مختلف ہے اپنے ہر ایک حریف کو وہ دشمن قرار نہیں دیتے ہیں۔ دشمن کے منصب پر فائز کرنے کے لئے بھی وہ اپنے حسن سلوک کو زیادہ ذمہ دار قرار دیتے ہیں اسی مشکوک رویئے کو راہی کے اس شعر نے واضح کیا ہے۔

دشمن نہ مرا کوئی بیٹھا ہو بلندی پر
سر کائے ہی جاتا ہے چٹانوں کو پربت سے

حالانکہ دشمنوں سے مخاطبے کے تحت غلام مرتضٰی راہی نے 'لاریب' کی ایک غزل میں بہت پہلے ہی کہا تھا۔

دیکھ پتھر کا کلیجہ میرا
یہ چمک تھی کہاں خنجر پہ ترے

چھوٹی بحر میں کہی گئی غزل کا یہ ایک شعر اپنے اندر ترکیب سازی کا حسن، معنویت کی گہرائی اور معاملۂ تقابل کو جتنی شعریت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اس پر داد خواہی مستحسن قرار دی جاسکتی ہے۔

جدید شاعری میں لمحات، وقت، صدی کے زوال پذیر ہونے اور شمار نفس کے

بعد لا حاصلی دامن میں سمیٹنے سے متعلق بے شمار اشعار کہے گئے ہیں۔فی الوقت بشیر بدر کا یہ شعر Haunt کرتا نظر آتا ہے۔

خوبصورت اُداس خوف زدہ
وہ بھی ہے بیسویں صدی کی طرح

اس شعر میں بشیر بدر بیسویں صدی کی الم ناکی، اس کی دین کو بہت اچھے ڈھنگ سے پروجیکٹ کرنے میں کامیاب رہے ہیں لیکن میری سمجھ سے شعر کی جو زبان ہے وہ غیر شعریت کے دائرے میں آتی ہے۔اس سے زیادہ کہیں بلیغ یہ مصرعہ ہے ''لمحوں نے خطا کی تھی، صدیوں نے سزا پائی'' دراصل میری دانست میں تاریخ سازی کا ہی نام نہیں ہے لمحے، ساعت، وقت، دن، مہینے، سال ایک پنچھی کی طرح پنکھ لگا کر نکل جاتے ہیں لیکن ایک حساس شاعر کے ذہن پر اس کے دیر پا اثرات مرتسم ہو کر رہتے ہیں۔غلام مرتضٰی راہی کا یہ شعر جدید عہد کا المیہ بھی ہے اور حسن بھی۔

جھپک گئی تھی گھڑی دو گھڑی کو آنکھ کہیں
سفر ہمارا اسی درمیان ختم ہوا

معنویت کے لحاظ سے گھڑی دو گھڑی کو آنکھیں جھپکنے کا جو خمیازہ شاعر بھگت چکا ہے اس کا ایسا بلیغ اظہار پوری جدید شاعری میں دیکھنے کو نہیں ملتا ہے۔دوسرے مصرعے نے تو پہلے مصرعے کے بے احتیاط سفر کی اُڑان کو جس ڈھنگ سے ذمہ دار قرار دیا ہے اس سے نہ صرف نزاکتِ شعر بڑھ گئی ہے بلکہ بلند بھی ہو گئی ہے۔

عام محاورے میں پیٹھ دکھانے کا مطلب شکست خوردہ ہو کر بھاگ جانے میں مستعمل ہوتا ہے لیکن غلام مرتضٰی راہی نے اس عام محاورے کے مطلب و معنی کا رخ ہی پلٹ دیا ہے۔یہاں دشمن کے بازو کا زور کم نہیں ہوا ہے بلکہ اس کے لوٹ کر جانے یعنی پیٹھ دکھانے کا مطلب گھوم کر ایک وار کرنا چاہتا ہے کے بھید کو کھولتا ہے۔

پیٹھ دکھلانے کا مطلب ہے کہ دشمن
گھوم کر اک وار کرنا چاہتا ہے

ہر جدید شاعر کے پاس اپنی تہذیبی اور سیاسی بصیرت نہیں ہوتی اگر اس کے پاس متعلقہ بصیرت ہوتی بھی ہے تو اسے اپنی شاعری میں بروئے کار لا کر ادب کے کینوس پر پھیلا بھی دے، یہ مادّہ سبھوں میں نہیں ہوتا۔ غلام مرتضیٰ راہی جدید شاعروں میں معدودے چند ان شاعروں میں ایک ہیں جو حالاتِ حاضرہ پر نظر رکھتے ہوئے سیاسی اقدار کی پامالی کا نوحہ بڑے سلیقے سے کرتے ہیں۔ ان کی اس نوحہ گری میں کہیں سے تیزابیت نہیں ہوتی۔ ہم انہیں بس شعر شور انگیز سے متصف کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ شعر۔

میرا ہی خون تھا جو پلایا گیا مجھے
جب سیر ہو چکا تو بتایا گیا مجھے

اسی غزل کے ایک مصرعہ میں غلام مرتضیٰ راہی نے ''قاتل بنا کے ہوش میں لایا گیا مجھے'' بھی باندھا ہے اس مصرعے کو بھی درج کرنے کی غرض یہ ہے کہ محولہ شعر اسی مصرعہ کا اختتامیہ بن کر ہمارے ذہن کو مہمیز کرتا ہے۔ راہی کے کلام کی ایک خصوصیت جو عام طور پر غزل کے قارئین کو متاثر کرتی ہے وہ یہ کہ انکے ہر ایک شعر میں کوئی ایسا لفظ ضرور ہوتا ہے جو کلیدی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ یہ لفظ بھاری بھرکم استعارے کے بوجھ سے دب گیا ہے بلکہ یوں ہوا ہے کہ یہی لفظ اپنی معنوی گھن گرج کے ساتھ دوسرے الفاظ پر حاوی ہے۔ اس شعر میں 'خون' کی معنیاتی تقلیب کئی صورتوں میں ہوئی ہے اسے ہم براہ راست طور پر بے رشتہ چہروں کے المیے سے بھی موسوم کر سکتے تھے۔ آخر وہ خون کس کا تھا اور کسے پلایا گیا ہے، پھر سیراب ہونے کی بات کیوں کہی جا رہی ہے۔ بغور اس شعر کی تہہ میں اترتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ نفس

مضمون وہ نہیں ہے جو ہم سمجھتے ہیں۔ یہ مضمون کئی زاویئے سے سوچے سمجھے جانے لائق ہے۔فریب ومکر کا جال، سیاست کی گرتی ہوئی سطح سے لہو کی قدر و قیمت بھی متاثر ہوئی ہے اس میں اپنے پرائے کی پہچان بہت مشکل ہوگئی ہے یہ تشریح مضمون کا ایک حصہ ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اس کے مختلف شعری ابعاد سامنے آسکتے ہیں۔

میں نے اپنے تحقیقی مقالے میں متعدد جگہ راہی کی غزلوں میں تحیر آمیزی کا ذکر کیا ہے۔ اردو کی نئی غزل میں راہی حیرت ناک پس منظر بیان کرنے کے لئے یاد کئے جاتے رہیں گے۔ ہر چند کہ یہ تحیر آمیزی 'لامکاں' سے 'لاکلام' تک آتے آتے کم ہوتی چلی گئی ہے لیکن 'لاشعور' تک پہنچنے کے بعد ایک خوشگوار تجربے میں ڈھل کر معنوی افق پر روشن ہوجاتی ہے۔

سب گھیر کر کھڑے ہوئے مجھ کو پھر اس کے بعد
حیران رہ گئے کہ تماشہ نہیں ہوں میں

جدید غزل میں اس نوع کی تحیر خیزی خلق کرنے والوں میں مصور سبز واری، بانی زیب غوری۔ غلام حسین ساجد، مظفر حنفی کے اسمائے گرامی ان کے مختلف اشعار کی روشنی میں چمکتے ہیں۔ راہی کا نام انکے بیچ بھرتی کا نہیں ہوسکتا اس لئے کہ جس وقت 'لاکلام' شائع ہوا تھا اس سے قبل ہی یہ مختلف رسائل و جرائد میں جس نوعیت کا راہی کا کلام شائع ہو رہا تھا وہ جدیدیت کا عبوری دور تھا۔ اس دور میں بھی راہی کے علاوہ حمدیہ اشعار میں یہ شعر کون کہہ سکتا تھا

شیشے کی طرح چمک رہی ہے
پتھر کی بارگاہ تیری

یہاں شیشے کے بعد پتھر محض تضاد لفظی کی صنعت کو فروغ دینے کے لئے نہیں آیا ہے۔ ہمیں سب سے پہلے اس کے معنوی نظام کی وسعت کو نظر میں رکھنے چاہیئے

تبھی ہماری خوش ذوقی شاداب ہوسکتی ہے۔ یہ پتھر کی بارگاہ کیا ہے؟ کاشی، متھرا کے بُت یا کعبے کا سنگ اسود؟ چشم قلب کی بصیرت کیا معنی رکھتی ہے؟ بہرلحاظ اگر ہم اس شعر کے بطن میں جھانک کر دیکھتے ہیں تو حیرت ہی حیرت نظر آتی ہے۔ راہؔی کے یہاں قدرت کی عطا کردہ وسیلوں، ذرائع، ارض وسماوات میں پھیلی نیرنگیوں کی جلوہ سامانی کا بھرپور مظاہرہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ غلام مرتضٰی راہؔی خدا کے وجود کا بہرطور قائل ہیں وہ اس بات پر متفق ہیں کہ کوئی تو ہے جو نظامِ ہستی چلارہا ہے۔ یہ دنیا ایک دن میں یا ایک لمحے میں وجود میں آئی ہوگی لیکن اس کی تعمیر میں صدیوں لگے ہیں۔ راہؔی کی نگاہ کارخانۂ قدرت میں ہر ایک شئے کی ترتیب پر لگی ہے تبھی تو اس نوع کا شعر ان کی نوک قلم سے نکلتا ہے۔

ترتیب سے حسن ہے جہاں کا
ایک چیز ادھر ادھر نہیں ہے

کبیر نے کئی موقعوں پر کہا ہے کہ آسمان کے تارے انتہائی بے ترتیب ڈھنگ سے بکھرے پڑے ہیں ایسا لگتا ہے کوئی ناتجربہ کار ہاتھ ایک ہی جست میں مٹھی بھرانگارہ سوئے آسمان پھینک کر فرار ہوگیا ہو۔ راہؔی چونکہ ایک جمالیاتی حس کے شاعر ہیں اس لئے کبیر کی ارضیت پسندی سے انکا کوئی علاقہ نہیں ہوسکتا۔ ان کا ذہن بار بار سوچتا ہے کہ قدرت کی بے ترتیبی میں بھی ایک ترتیب ہے۔ جس شئے کو جہاں ہونا چاہیئے وہاں وہ نصب ہے۔ محولہ شعر سے ہٹ کر ایک اور شعر راہؔی کے خدا سے قرب کا اعلان یوں کرتا ہے کہ

اب دور نکل چکا ہے اتنا
بندے کو خدا کا ڈر نہیں ہے

اس شعر میں بندے کا دور نکلنا کیا ہے؟ یہ لباس بشری فرشتے کی تمنا بھی نہیں

ہے یا پھر انسان ہونے کی غلط معنویت کا اشاریہ ہے بقول اقبال ۔

جب سے دیکھا ہے لباس بشری میں تجھ کو
ہر فرشتے کی تمنا ہے کہ انساں ہوتا

انسان ہونا آدمی ہونے کی منزل سے آگے کا مرحلہ ہے یہ راحل پر منحصر کرتا ہے کہ اپنی منزل کا تعین خود کرے اور منزل سے عدم آگاہی کی صورت میں آگے نہ چلا جائے۔

ہم جس عہد سے گذر رہے ہیں حضرتِ انسان کہاں پہنچ چکا ہے یہ ہم سب کو پتہ ہے۔ بشر جو بندہ بھی ہے وہ اپنے معبود تک کیسے رسائی حاصل کر سکتا ہے جب وہ کافی دور نکل چکا ہے۔ راہی نے دور نکل چکا ہے استہزائیہ رنگ میں پیش کیا ہے ورنہ بندے کی کیا مجال کہ وہ دور تو کیا قریب رہ کر بھی بھٹک سکتا ہے۔ عرفانِ ذات اور عرفانِ معبود میں بہت فاصلہ ایسے بھی کم ہوتا ہے۔ راہی کا کمال ہے دور نکل چکا ہے کے ایک عام نثری ٹکڑے سے شعر کی بھرپور تعظیم کی ہے۔ راہی نے ایک جگہ اس طرح کا شعر بھی کہا ہے ۔

گے بار کھلی ہے آنکھ مری
معلوم ہوا سحر نہیں ہے

اس کی بحر ''مفعول مفاعلن فعولن'' ہے اور خاصی مشکل بحر ہے۔ اس بحر کو برتنے والے اکثر غچّہ کھا جاتے ہیں کیوں کہ اس کی تقطیع دوسرے زحاف سے ممکن نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے دو مصرعوں میں نثر کے دو ٹکڑے رکھ دیئے گئے ہوں اور معنی تلاش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ لیکن راہی کے یہاں نثری نظم و ضبط میں بھی معنویت کی جو موسیقی ہے وہ جمالیات کے انوکھے رنگ کو پیش کرنے کے لئے کافی ہے۔ آنکھوں کا سو بار کھلنا، مضطرب ہونے کی انتہا ہے یعنی نیند بھی آتی نہیں اور خوف

بھی لاحق ہے کا اشتباہ پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں انتہائی فطری طور پر ''معلوم ہوا سحر نہیں ہے'' بظاہر عام سا مصرعہ ہے لیکن سحر نہیں ہے کی معنویت کی گہرائی پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ساعت نصیب کرتی ہے۔

اب راہیؔ کے تازہ ترین مجموعہ کلام 'لاشعور' سے ایسے اشعار نقل کئے جاتے ہیں جن میں حیرت ناکی کے مظاہر سامنے آتے ہیں لیکن ان میں وہ شدّت نہیں ہے کیوں کہ 'لاشعور' میں چونکانے کا عمل شعوری نہیں ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل اشعار۔

بعض خوشیاں نہیں جینے دیتیں
بعض غم عمر بڑھا دیتے ہیں

لے کے صیاد سے ہر قیمت پر
ہم پرندوں کو اُڑا دیتے ہیں

پیش آتے ہیں وہ سب سے یکساں
سب کو مٹی میں ملا دیتے ہیں

شفق کا نظارہ جنہیں دیکھنا ہو
ہماری سحر شام میں ڈھل رہی ہے

کہیں دن چڑھے جاگے ہشیار ہوگی
مری صبح آنکھیں ابھی مل رہی ہے

یہ تیرے رنگ و نور کے ماخذ کا ہے سوال
اے میرے ماہتاب ! مجھے آفتاب لکھ

محولہ اشعار میں بھی حیرتنا کی موجود ہے لیکن ایک مخصوص طرز فکر کے ساتھ ان تحیر خیزی میں حسن مروت، انسان دوستی، طنز، عمیق مشاہدے کی سطح پر مختلف رنگوں کے

جھل مل نقوش یکے بعد دیگرے موجودات کی صف میں ترتیب پاتے ہیں۔آخری شعر میں راہیؔ کی علمیت کا بر ملا اظہار ہوتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس مضمون کو جس ڈھنگ سے باندھا ہے اس میں خاکساری کی اتنی پسندیدہ لئے موجود ہے کہ آفتاب سے ماہتاب کی مستعار روشنی کا بھید کھل جاتا ہے۔راہیؔ نے آفتاب کو ماخذ کہہ کر اس کی عزت افزائی بھی کی ہے اور ماہتاب کے گہرے تعلق کا بھی ایک ساتھ انکشاف کر دیا ہے۔

میں نے راہیؔ کے جن اشعار کے حوالے جدّت اور جدیدیت کے پس منظر دیئے ہیں خصوصی طور پر راہیؔ کے کلام کے ابتدائی مرحلے میں بھی حیرت انگیزی کو سامنے لایا گیا ہے۔ساتھ ہی 'لامکاں' کے بعد 'لاشعور' تک تحیر خیزی کو برتنے میں راہیؔ کے یہاں جو بنیادی طور پر تبدیلی آئی ہے اس کا بھی مجموعوں کی روشنی میں عہد کی تقسیم کو روا رکھتے ہوئے اس ہنر کو مختلف زاویئے فکر سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس مطالعے کی روشنی میں ، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ راہیؔ کے کلام میں جدّت اور جدیدیت کی تفریق بہت واضح انداز میں موجود ہے اس لئے اس ضمن میں کسی کو غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے کہ راہیؔ جدّت اور جدیدیت دونوں کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں۔

****

باب نمبر۵۔

غلام مرتضیٰ راہی کی شاعرانہ ذہنیت

''غلام مرتضیٰ راہیؔ کی شاعرانہ ذہنیت'' میری تخلیق کا عنوان ہے۔اس مضمون سے میں غلام مرتضیٰ راہیؔ کی اس شاعرانہ ذہنیت کا انکشاف کرنا چاہتا ہوں جسکی وجہ سے ان کے شاعرانہ تشخّص میں آسانی ہوئی ہے۔ ذہنیت کے لئے انگریزی میں Mentality لفظ مستعمل ہوسکتا ہے۔اس لئے کہ فکری نظام کی تلاش اور ذہنیت کا انکشاف دونوں قریب المعنیٰ اور مترادف نظر آتے ہیں۔غلام مرتضیٰ راہیؔ جدید شعراء میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ان کے پانچ شعری مجموعے بعنوان 'لا مکاں'، 'لاریب'، 'حرف مکرّر'، 'لاکلام' اور 'لاشعور' شائع ہو چکے ہیں۔ایک مجموعہ ہندی میں بعنوان 'سدا بہار غزل' شائع ہو چکا ہے۔اس طرح ان کے شعری مجموعوں کی اشاعت کی تعداد چھ تک پہنچتی ہے۔راہی کے شعری سفر کا محاسبہ اگر کیا جائے تو اس نتیجے پر پہنچنے میں آسانی ہوتی ہے کہ وہ زود گو سے کہیں زیادہ پختہ گو کی حثیت سے ہمارے درمیان آتے ہیں۔ پختہ گوئی کی اوّلین شرط یہ بھی ہے کہ وہ مقدار سے زیادہ معیار پر دھیان مرکوز کرے۔راہیؔ کے یہاں شروع سے ہی ایک بات محسوس کی گئی ہے کہ انہوں نے مجموعے کی اسم سازی میں بھی سلیقہ مندی کا مظاہرہ کیا ہے۔مثال کے طور پر لا مکاں، لاریب، لاکلام، لاشعور وغیرہم۔ان چاروں مجموعے کے نام سے یہ منکشف ہوتا ہے کہ ان ناموں کی معنوی صفات خدائے بزرگ و برتر سے جڑی ہوئی ہیں۔ربّ قدیر لامکاں، لاریب ہونے سے متصف ہے اور واحد مطلق ہے۔ یعنی اکیلا۔ قُرب

خداوندی سے اپنا رشتہ ہموار کرنے کے لئے اور خدا سے مکالمہ کرنے کے لئے جس طرح کی ذہنی بالیدگی کی ضرورت ہوتی ہے میں سمجھتا ہوں راہیؔ میں بہت زیادہ ہے۔ شاعرانہ ذہنیت کے اسرار سے پردہ اُٹھانے کے لئے ان مجموعوں کے نمائندہ اشعار اکٹھے کئے جائیں تو راہیؔ کی شناخت آسان ہوسکتی ہے۔راہیؔ پر متعدد مضامین لکھے گئے ہیں۔جس سے انکے فکر وفن اور جدّت طرازی کی مثالیں قائم ہوتی ہیں۔ساتھ ہی جدیدیت کے فلسفیانہ تصور کے اطلاق کو بھی ان کے اشعار کے حوالے سے رائج الوقت سکہّ قرار دیا گیا ہے۔سو کوئی وجہ نہیں کہ ان کی شاعرانہ ذہنیت کا مکمل طور پر سراغ نہ لگ سکے۔جدید غزل کے قارئین وسامعین اچھی طرح سے سمجھتے ہیں کہ جب چھٹے دہے کے اوائل میں نیا کہنے کے نام پر دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی مہمل گوئی اور پھکڑ پن کا دور دورہ تھا ایسے میں چند ہی نام ایسے تھے جو غزل کی آبرو کے ساتھ کھلواڑ کرنے سے پرہیز کئے بیٹھے تھے۔ان میں ایک نمایاں نام غلام مرتضیٰ راہیؔ کا بھی تھا۔یہ پرہیز لاشعوری نہیں تھا بلکہ بیداریٔ شعور کا نتیجہ تھا۔راہیؔ کا چونکہ تعلق روایت کی حسین پاسداری سے بھی تھا اور ترقی پسندانہ ذہن کے اعتدال پسند رویئے پر بھی نظر تھی اس لئے انہوں نے وہ صالح طریقہ کار اپنایا جس سے ان کے صحت مند ذہنی رویئے کی تفہیم میں آسانی ہوئی۔

یہاں یہ امر واضح کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ غلام مرتضیٰ راہیؔ ابتداء میں نظموں کی طرف راغب تھے۔راہیؔ، سردار جعفری، کیفی اعظمی اور اویس احمد دوراں کی طرح مشاعروں میں اپنی گھن گرج سے سماں باندھنا چاہتے تھے۔ان کی نظمیں ترقی پسند تحریک سے متاثر تھیں۔افلاس زدہ،لوگوں کی حالت زار اور استحصال کے خلاف وہ بھی دوسرے شعراء کے سُر میں سُر ملاتے نظر آئے لیکن ان کیفیات کے باوجود ان کی نظموں میں ایک انفرادی سوچ پوشیدہ تھی اور اسی انفرادیت نے بعد میں انہیں غزلوں سے قریب کر دیا۔ایسی نظمیں جو ترقی پسندانہ تیور کی سرحد کو چھوتی ہیں ان میں 'تاریخ'،

'جگالوں تو چلوں'، دوسری جنگ عظیم کا ایک اہم موڑ، 'مشعل راہ حقیقت' 'گور غریباں، مجذوب کی بڑ، بھکارن وغیرہ خاص ہیں۔ان نظموں کی طوالت انہیں مکمل طور پر پیش کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ہاں ان کے ایک دو بند یا چند مصرعوں کو ان کی ذہانت اور شعری رجحان کو سمجھنے کے لئے پیش کرنا ضروری ہے۔

تیرے اوراق الٹتے رہے آئین حیات
ہر نئے باب میں کھلتا گیا دنیا کا بھرم
سازشِ وقت بدلتی گئی حالات کا رُخ
بڑھ گیا حد سے جہاں سلسلۂ مشقِ ستم
کتنے اوراق ابھی اور مکمل ہوں گے؟
کتنے عنوان ابھی دے مورّخ کا قلم؟
حدِّ تکمیل کو پہنچے گی کہاں تیری حیات؟
کون سے موڑ پہ ٹھہریں گے زمانے کے قدم؟

(تاریخ، مطبوعہ 'شاعر'، بمبئی، فروری ۱۹۶۵ء)

انقلابات نے بدلا تو زمانے کا چلن
پھر بھی موجود ہے تاریخ کے ماتھے پہ شکن
اب بھی توہین کے زمرے میں ہیں آدابِ وفا
ابھی ترتیب خزاں ہے پسِ تزئین چمن
اثر انداز نہیں بندشِ ترغیب گناہ
اتر آتے ہیں ابھی شیشہ و ساغر میں بدن
آج بھی شہروں کے ہنگامۂ تنہائی میں
ہے وہی دشت نور دی، وہی دیوانہ پن

بربریت کے شراروں کو بجھا لوں تو چلوں
اپنے خوابیدہ عزائم کو جگا لوں تو چلوں

(''جگا لوں تو چلوں''۔مطبوعہ جاں نثار،امرت سر۔سالنامہ ۱۹۶۸ء)

کہ پھر پنپ گیا ذوقِ کمالِ تیشہ زنی
سوار ہو گیا اعصاب پر طلسم جنوں
شعور کھا گیا دانستہ آ گہی کا فریب
پڑا جو بوجھ روایات کے تقاضوں کا
سروں پہ جھک گئیں ایوانِ نو کی شہتیریں
اٹھی جو چیخ تغیر پذیر فطرت کی
لرز کے رہ گئی بنیاد قصرِ یک جہتی

(دوسری جنگ عظیم کا ایک اہم موڑ۔مطبوعہ شاعر۔بمبئی اگست رستمبر ۱۹۶۷ء)

تیری تصویر کو کچھ اور نمایاں کر کے
آئنہ خانۂ گلزار و بیاباں کر دوں
آ تری مانگ میں اشکوں کے شرارے بھر کر
مشعلِ راہِ حقیقت کو فروزاں کر دوں

(مشعلِ راہِ حقیقت،مطبوعہ شاخسار۔کٹک،دسمبر ۱۹۶۶ء)

منتشر سا ہے مرا شیرازۂ سوز دروں
اک جہانِ خامشی ہے اور مرا سیل جنوں
ہر طرف افسردگی کا عالم بے نور ہے
غم زدہ ماحول سارا فرطِ غم سے چور ہے
وادیٔ گور غریباں ساکت و مدہوش ہے

جس میں میری فکر کا اک نغمۂ خاموش ہے

(گورِ غریباں، مطبوعہ روزنامہ پیغام، کانپور۔ ۱۰ر مئی ۱۹۶۶ء)

بھر لیا مورّخ نے خون سے قلم اپنا
غالباً نئی تاریخ اب نہ خود کو دہرائے
صور پھونک دے کوئی ایٹمی ذخیروں میں
یہ جہانِ آب و گل ختم ہو کے رہ جائے

(مجذوب کی بڑ، مطبوعہ خاتونِ دکن، حیدرآباد شمارہ ستمبر ۱۹۶۷ء)

صفحۂ دہر پہ اک ہستی بے نام و نشاں
لب و رخسار پہ چھائی ہوئی غربت کی خزاں
فکر و احساس میں اک دردِ مسلسل رقصاں
اشکِ خونیں سے عیاں شدتِ قلب سوزاں
بھوک جب پیراہنِ ضبط جلا دیتی ہے
ظرف کے تاج کو قدموں میں جھکا دیتی ہے

(بھکارن، خاتونِ دکن، حیدرآباد، مئی ۱۹۶۶ء)

راہی کی دین داری ان کی شاعری میں بھی جھلکتی ہے ان کی شروعاتی نظمیں طلوعِ صبح اسلام، قرآن پاک اور کربلا تکمیل عشق میں اس کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ انہوں نے مذہبی پاسداری کو ہمیشہ برقرار رکھا ہے خواہ وہ نظمیہ شاعری ہو یا غزلیہ۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں فیشن زدگی کی پود پنپ نہیں سکی۔ اس لئے پورا شعری سرمایہ پاک وصاف نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کی نظموں کے یہ بند۔

تھا ہر اک حد سے سوا سلسلۂ مشقِ ستم
سُرخیاں خون سے لکھتا تھا مورّخ کا قلم

پڑتے تھے پوری طرح قصرِ مذلّت میں قدم
تھی زمیں بوس سرفرازیٔ ابنِ آدم
دفعتاً چاک ہوا پیراہن تیرہ شبی
صبح بیدار ہوئی رُخ پہ لئے نورِ نبی
(طلوعِ صبحِ اسلام، مطبوعہ حریم، لکھنؤ ۱۹۶۶ء)

شاہد ذاتِ بعید از ممکنات
مدّعائے خالق کل کائنات
اک مکمل درسِ آئینِ حیات
اشرف المخلوق کی راہِ نجات
از زمیں تا آسماں جس کا وقار
باوجودِ انقلابات ہزار
(قرآن پاک، مطبوعہ حریم لکھنؤ۔ نومبر ۱۹۶۷ء)

مدّتوں رہیے سراپا تشنۂ تکمیل عشق
کرتے رہیے جستجوئے سنگ ہائے میل عشق
تشنگی اور خونِ ناحق کا کرشمہ دیکھئے
قطرے قطرے ذرے ذرے سے ہوئی تشکیل عشق
آب دریا میں نظر آئی کسے اوروں کی پیاس
کس نے نیزے کی انی سے کھول دی زنبیل عشق
خون سے لختِ جگر کی کس نے نم کی انگلیاں
مندرج کی کس نے لوحِ عرش پر تفصیل عشق

نیزۂ و شمشیر و خنجر سے لیا کس نے خراج
قلزم خوں میں اتر کر کس نے کی تعمیلِ عشق
پائے استقلال پر کس نے عمارت سادھ لی
کس نے روشن کر کے رکھدی بام پر قندیل عشق
آئینہ ایسا کہ جو جس رخ سے چاہے دیکھ لے
حُسن کا ابلاغ بھی وہ اور وہی ترسیل عشق
مٹ مٹا کر کر دیا نصب ایک کتبہ اس طرح
عشق کا آغاز کعبہ ، کربلا تکمیل عشق

(کربلا تکمیل عشق، مطبوعہ روزنامہ سیاست جدید، کانپور ۱۹۶۹ء)

راہیؔ کے یہاں عشق کا مفہوم دیگر شعراء سے جداگانہ ہے۔علامہ اقبال نے

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

کہہ کر جس عشق کا آغاز کیا تھا اسے راہیؔ نے پایۂ تکمیل تک پہنچادیا۔''عشق کا آغاز کعبہ، کربلا تکمیل عشق'' اس سے بہتر اور مستند تعریف عشق کے حوالے سے دنیائے شعرو ادب میں آج تک پیش نہیں کی گئی۔''کربلا تکمیل عشق'' ذہن پر گہرے نقوش چھوڑتی ہے۔راہیؔ کی فکری اُڑان دنیائے شاعری میں مستحکم ہو چکی ہے۔ان کا فکری احساس رگِ گُل کی طرح نازک بھی ہے اور سوز برق تپاں بھی۔ان کے اشعار کی شیرینی قاری کو متوجہ کئے بغیر نہیں رہتی۔انہوں نے خود اسکا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے۔

میرا احساس رگ گل کی طرح نازک ہے
لفظ و معنی کے گہر جس کو جلا دیتے ہیں

میری ہستی میں درخشاں ہیں وہ اسرار و رموز
میرے اشعار میں جو روح پلا دیتے ہیں

میرے ہمدم مرے اشعار پہ تنقید نہ کر
(تنقید، رسالہ پگڈنڈی، امرت سر۔ مارچ ۱۹۶۶ء)

میرا احساس، سوزِ برقِ تپاں
میرا انداز، جزد عالمِ کل
میرے افکار، رقصِ نجم و قمر
میرے اشعار، بزم شبنم و گل
(تاثرات، مطبوعہ رسالہ پگڈنڈی، امرت سر۔ اگست ۱۹۶۶ء)

شہیدان وطن کی شان میں بیشتر شعراء نے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔راہی نے بھی ان پر اپنے عقیدت کے پھول نچھاور کیئے ہیں۔وطن دوستی، قومی یکجہتی اور نئی نسلوں کو باخبر کرنے کا چلن نظمیہ شاعری کا ایک حصہ رہا ہے۔راہی بھی اس روایت کی پاسداری کرتے نظر آتے ہیں۔

قلم اٹھایا تری شان میں مورّخ نے
تری حیات کو تاریخ نے جلا بخشی
افق کے جام میں اترا لہو کا عکس جمال
سحر سے پہلے ترے حوصلے کی پو پھوٹی
(شہید وطن، مطبوعہ سالہ پگڈنڈی، امرت سر، جون ۱۹۶۷ء)

تو چٹانوں کی مانند محکم بھی ہے، تیرے سینے میں انسان کا غم بھی ہے
تیری قول وعمل سے یہ ثابت ہوا امن شعلہ بھی ہے امن شبنم بھی ہے
(اے میرے وطن، مطبوعہ نیا دور، لکھنؤ ۱۹۶۶ء)

جس میں ہو ہر رنگ اجاگر بھلی لگے تصویر وہی
جس کی کڑی کڑی مل جائے کام کی ہے زنجیر وہی
یک جا ہو جائیں سب صوبے، سارے شہر، سبھی دیہات
جس میں پوری قوم ہو شامل ملک کی ہے تعمیر وہی

(قومی یکجہتی، مطبوعہ نیا دور، لکھنؤ، ۱۹۷۰ء)

محولہ تمام نظمیں ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۶ء کے وسط کی ہیں۔راہیؔ کی نظم گوئی کا وقفہ کل ڈھائی برسوں پر محیط ہے۔راہی بہت جلد غزلوں کی طرف مائل ہو گئے۔ان کی نظموں کی تعداد بہت محدود ہے۔اس لئے ان پر سیر حاصل گفتگو نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی کوئی نتیجہ برآمد کیا جا سکتا ہے۔ہاں اس سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ آغازِ شاعری میں وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے۔لیکن حقیقی طور پر ان کی شاعرانہ ذہنیت کا پتہ ان کی غزلوں سے ہی ہوتی ہے۔

غلام مرتضیٰ راہیؔ کی شاعرانہ ذہنیت کے بارے میں اعلیٰ مرتبت ناقد شمس الرحمٰن فاروقی کی یہ رائے نقل کر رہا ہوں جس کے حوالے سے راہیؔ کی غزلیہ شاعری کا نمایاں وصف سامنے آتا ہے۔بقول شمس الرحمٰن فاروقی ؎

"ان کی غزلوں میں ایک ایسا شخص نظر آتا ہے جو متفکّر، تھوڑے سے چلبلے، درّاک انانیت اور قوت سے بھرپور ذہن رکھتا ہے۔سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ شاعر کی شخصیت حقائق حیات، مفاہمت کرنے کے بجائے ان سے ستیز کرتی نظر آتی ہے اور اس ستیز کا آہنگ انتہائی ذاتی ،انتہائی داخلی، دروں بینی اور جگہ جگہ نوکدار استعاروں اور غیر متوقع تناظرات سے عبارت ہے تشکیک اس کا پہلا حربہ ہے جو عمومی مشاہدات کو ایک تیسرا ابعد بخش دیتا ہے۔تفکرّ اور تجسّس کی جو منزل غلام مرتضیٰ راہی کے اچھے شعروں میں نظر آتی ہے وہ خود ترحمی بے چارگی اور بے اثری سے بہت آگے ہے" [1]

---

[1] غلام مرتضیٰ راہیؔ کی شاعری سے متاثر ہو کر شمس الرحمٰن فاروقی کی رائے

راہیؔ کے سلسلے میں فاروقی نے جو رائے دی ہے ان کے ابتدائی کلام سے متاثر ہو کر دی ہے۔ اب تک راہیؔ نے اپنے فکری اور استعاراتی نظام میں بہت سی تبدیلیاں کی ہیں۔ یہ تبدیلیاں کسی مصنوعی کوشش یا ارادی طور پر نہیں ہوئی ہیں بلکہ ان کے شعور کی پیش قدمی کے نتیجے میں سامنے آتی ہیں۔

فاروقی نے متفکّر، تھوڑے سے چلبلے، درّاک انانیت اور قوت سے بھرپور ذہن کیلئے جو ابعاد ظاہر کئے ہیں وہ راہیؔ کو سمجھنے کیلئے بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ان فرمودات کی روشنی میں راہیؔ کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

دکھائی دیتا نہیں دور دور تک لیکن
کوئی اشارے سے جیسے ہمیں بلاتا ہو

مرا وجود بھی کیا موجِ تہہ نشیں ٹھہرا
جو سطح بیں مجھے خاطر میں اپنی لا نہ سکا

وقت کہاں تک مری خاک اُڑائے گا
میں تو لپٹا ہوں مٹی کی چادر سے

ملے تو جیسے ہزاروں برس کے بچھڑے تھے
لپٹ کے روئے بہت دیر آسمان و زمیں

(فکری نظام)

میں اپنے ہاتھوں میں پتھر لیکر بھی
آئینے کے آگے جاتے ڈرتا ہوں

اک جال سا پھیلا تھا بکھرے ہوئے دانوں پر
اور میری نظر مجھ کو اک داؤ میں ہار آئی

ہر زاویئے سے روشنی مجھ پر پڑی مگر
سایہ ہی مرے چاروں طرف گھومتا رہا

(درّا کی)

لگے تھے راکھ کے انبار میرے چاروں طرف
عجیب آگ تھی مجھ میں کہ میں دبا نہ سکا

(ستیز)

غلام مرتضیٰ راہی کے سلسلے میں ممتاز ناقدین کے علاوہ معاصرین میں اہم شعراء نے انکے تئیں بے حد مثبت آراء قائم کی ہیں۔ ان میں شہر یار، وحید اختر، باؔنی، خلیل الرحمٰن اعظمی، مظفر حنفی، بلراج کومل، مصور سبزواری کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ سبھوں کے لیے انکی تخلیقات میں لہجے کی گھلاوٹ ،انکے عمیق مشاہدے، مطالعے اور خود احتسابی کے عمل سے پیدا شدہ محرکات باعثِ کشش رہے ہیں۔ سب سے پہلے میں راہی کی شاعرانہ ذہنیت کے متعلق واضح کرنا چاہتا ہوں کہ راہی کے یہاں ششدر کرنے والے محرّکات ایسے نہیں ہیں جسے تخلیق کرنے کے لئے انہیں شعوری کوشش کرنی پڑی ہو۔ شعری عمل میں ان کی طبیعت کا سب سے بڑا دخل یہ ہے کہ عمومیت سے پرہیز کرنے کا بڑا ہنر مند سلیقہ ایجاد کرلیا ہے۔ ان کے اس وصف کے متعلق بہت سارے ناقدین نے توجہ مبذول کی ہے۔ ان کے یہاں جدید لفظیات کا ڈھیر نہیں ہوتا۔ وہ کسی بھی لفظ کو خلاقانہ طبیعت سے مرعوب کرکے معانی کی تفہیم سازی میں کامیاب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید اختر نے اس معنویت کی رائے یوں پیش کی ہے۔

"جدید غزل کے علائم واستعارات بھی تقلیدی ذہنوں کی غیر تخلیقی قافیہ پیمائی کے ہاتھوں معنی کھوتے جارہے ہیں۔ راہی نے بظاہر پٹے ہوئے الفاظ اپنے محسوسات

سے ہم آہنگ کر کے داخلی تجربے اور خارجی حقائق کی زبان بنانے کا گُر سیکھ لیا ہے اور اسی لئے غزل گوشعراء کے ہجوم میں جہاں چہروں میں امتیاز کرنا مشکل ہے راہیؔ کی آواز کا چہرہ دوسروں سے ممتاز اور منفرد ہو کر پہچانا جانے لگا ہے۔ان کی آواز کے چہرے کے ایسے عکس ہر ہر چہرے پر چمک رہے ہیں۔'' میں اس باب میں راہیؔ صاحب کی شاعرانہ ذہنیت کوکئی زاویئے سے منعکس کرنے کی پُرخلوص کوشش کرتے ہوئے یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ان کے یہاں موزوں الفاظ کے انتخاب میں نکتہ رسی کا جوہر کھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔مترادف الفاظ کی بھیڑ میں کسی ایک لفظ کا انتخاب اس سلیقے سے کرتے ہیں کہ قارئین ششدر رہ جاتے ہیں۔یہ صوتی اور معنوی خوبیوں کے باب میں بہت بڑی پیش رفت ہے۔

''لاریب'' پڑھ کر شہریار نے لکھا ہے کہ اس میں شامل غزلوں کی قرأت کرنے کے بعد یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ ان کو برابر شعر کہتے رہنا چاہئے۔ان کے اشعار پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے پاس کہنے کوکچھ **ایسی باتیں ہیں جو صرف شعر میں کہی جا سکتی ہیں**۔اس زمانے میں بہت سے لوگ شعر میں وہ باتیں کہنے لگے ہیں جس کا اظہار دوسرے طریقے سے زیادہ بہتر ہوسکتا ہے اس لئے بے جان اور بے اثر شاعری کی بہتات ہے۔

یہاں جو اہم بات شہریار نے کہی ہے وہ اس معنی میں لائق توجہ ہے کہ راہیؔ کی شاعرانہ ذہنیت میں مشکل پسندی سرایت کر چکی ہے۔شعریت پیدا کرنے کے لئے اس سے اچھا خراج اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ '' کچھ ایسی باتیں ہیں جو صرف شعر میں کہی جا سکتی ہیں'' یہ راہیؔ کی شاعرانہ ذہنیت کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔

جدید غزل کے معتبر شاعر بانیؔ نے راہیؔ کے کلام پر اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے ''میں تمہاری شاعری کو بے حد پسند کرتا ہوں۔تمہارا انفرادی رنگ

پورے مجموعے سے ظاہر ہے۔ادھر تمہارے مجموعے پر تبصرے نظر سے گذرے، بہت سی خوبیوں کا انہوں نے ذکر نہیں کیا۔تم کوئی معمولی غزل گو نہیں ہو۔میں غزل کے میدان میں تمہیں سلطان اختر اور زیب غوری کو بہت اہم سمجھتا ہوں''۔

باقی ایک ایسے شاعر تھے جو بہت کم معاصرین پر نگاہ توجہ ڈالتے تھے۔راہی کے سلسلے میں یہ کہنا کہ تم کوئی معمولی غزل گو نہیں ہو اور پھر سلطان اختر اور زیب غوری کے نام گنواتے ہوئے انہیں پسندیدہ شاعر قرار دینا بہت اہمیت کا حامل ہے۔

محولہ سطور کو لکھنے کی غرض یہ ہے کہ باقی نے جن شاعرانہ خصائص کی بنیاد پر راہی کے کلام کو سراہا ہے وہ بحیثیت مجموعی نہ ہو کر اکائی کی صورت میں ہے۔سبھی جانتے ہیں کہ راہی کا مضطرب ذہن اور تجسّس آمیز رویہ دوسروں سے کس معنوی سطح پر متمائز کرتا ہے۔شہر یار نے انکے کلام میں غزل کی نزاکتوں اور بلاغتوں کا ذکر کیا ہے۔یہ نزاکتِ شعری یونہی کسی کے حصے میں نہیں آجاتی۔یہ نزاکت راہی کی شخصیت کا ایک حصہ ہے جو آبگینۂ احساس کے قریب لے جاتی ہے۔اور ہاتھ میں پتھر رہتے ہوئے بھی واپس ہونے پر مجبور کرتی ہے۔

مصور سبزواری اور غلام مرتضیٰ راہی دونوں ہی ہم عصر ہیں۔دونوں کے یہاں جدید شعری حس موجود ہے۔مصور سبزواری کے یہاں ڈر،خوف، سراسیمگی کی کیفیت ملتی ہے۔راہی کے یہاں اس ڈر، خوف اور سراسیمگی سے پردہ اٹھانے کے پہلے ایک منضبط شعور و ادراک کا اظہار نمایاں طور پر ملتا ہے جو انکی کرید اور تجسّس آمیز ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے۔راہی کی شاعرانہ ذہنیت کے باب میں مشہور ناقد و شاعر عشرت ظفر نے ایک مبسوط مقالہ بعنوان ''راہی کی غزل میں آفاقی جمالیات و زمانی تصور'' لکھا ہے جو انکی کتاب حرف باریاب میں شامل ہے۔''حرف باریاب'' غلام مرتضیٰ راہی کی غزلوں کے تنقیدی مطالعے پر مشتمل ہے جو راہی شناسی کے لئے حوالے کا کام دیتی رہے گی۔عشرت ظفر نے رونق شہری کے مضمون ''جدید غزل کا سنگ

میل۔۔غلام مرتضیٰ راہی'' کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس وقیع اور مبسوط مقالے میں راہیؔ کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے جس میں ان کے یہاں واحد متکلم کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ واحد متکلم میں ایک زمانی، آفاقی تصور موجود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب نے اپنے یہاں واحد متکلم کا استعمال سب سے زیادہ کیا تھا۔نئی غزل کے شعراء کے یہاں بھی اس صیغے کے حوالے سے پوری کائنات کو دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

''نئی غزل میں فردیت پسندی ایک عام رجحان رہی ہے۔ اسے دوسری صورت میں واحد متکلم کی موجودگی سے موسوم کیا گیا ہے۔ پوری اردو شاعری میں واحد متکلم کا جتنا بلیغ اظہار غالبؔ کے یہاں ملتا ہے اس کا دس فیصد حصہ بھی نئے غزل کے معماروں کے یہاں نہیں ہے۔ناقدین غزل نے جن جدید شعراء کی فہرست سازی کی ہے اس میں فردیت پسندی کے لحاظ سے بیشتر ایک جیسے ہیں۔اس کی کئی وجوہ ہیں غالبؔ اپنے عہد کا معقول نبّاض ہے۔ ۱۸۵۷ء کا غدر کھلی آنکھوں سے دیکھنے والا اپنے ذہنی انتشار سے کم پریشان نہ تھا۔اس فردیت نے انفرادیت کے زمرے میں آنے کے بعد غالب کو شخصی اظہار کا شاعر بنا دیا۔نئی غزل میں بانیؔ ذہنی اعتبار سے غالبؔ کے اتنے قریب رہے ہیں کہ اس نے بھی اپنے طرز اظہار میں تنہا انسان کی سائیکی کو بڑے فطری ڈھنگ سے شعر کے کینوس پر اتارا۔ میں سمجھتا ہوں کہ بانیؔ کے بعد اردو غزل میں فردیت اور شخصی مطالعہ کے باب میں غلام مرتضیٰ راہیؔ بمشکل حیثیت ثانی کے حامل قرار دیئے جاسکتے ہیں کیوں کہ بانیؔ کا شعری سرمایہ غلام مرتضیٰ راہیؔ سے کم ہے اس لئے مبادیات کے اعتبار سے غلام مرتضیٰ راہی ان پر بھاری پڑتے ہیں'' [۱]

میں نے یہ طویل اقتباس اس لئے پیش کیا ہے کہ راہیؔ کی شعری طبیعت کو

---

[۱] حرف باریاب۔(عشرت ظفر) سے ماخوذ

غالبؔ سے مربوط کرتے ہوئے واحد متکلم کے باب میں 'لاشعور' کے خالق کہاں ٹھہرتے ہیں۔ کہنے کا غرض یہ ہے کہ راہیؔ کی شاعرانہ طبیعت غالبؔ کی طبیعت سے بہت ساری جگہوں پر میل کھاتی ہے۔ خصوصاً واحد متکلم کے حوالے سے انہیں دریافت کرنے میں بہت آسانی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عنصر بھی انکی شاعرانہ ذہنیت کا ایک حصہ ہے۔

اب راہیؔ کے وہ اشعار نقل کئے جاتے ہیں جو انکے تازہ ترین شعری مجموعے میں شامل ہے اور انکی شاعرانہ ذہنیت کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

پل پل کی میں روداد رقم کرتا چلا جاؤں
صدیوں کے لئے خود کو بہم کرتا چلا جاؤں

(حلول آمیزی)

شفق کا نظارہ جنہیں دیکھنا ہو
ہماری سحر شام میں ڈھل رہی ہے

(خود احتسابی)

کسی کسی جگہ محفوظ ہے ابھی دہلی
کہیں کہیں پہ کھڑی ہے فصیل اپنی جگہ

(علائم و آثار)

نہ کوئی رنج تھا جس میں نہ کوئی راحت تھی
حیات کا وہی عرصہ مجھے گراں گزرا

(تیسرا سلوک)

نکالا کانٹے سے کانٹا کبھی کبھی ہم نے
چبھے تو دونوں مگر ایک مہربان ٹھہرا

(مضمون آفرینی)

اسے ہے کام، رہنا ہے یہاں جس کو ہمیشہ
کوئی اس کے سوا رہ کر ہمیشہ کیا کرے گا

(فُقر)

یہ تیرے رنگ ونور کے ماخذ کا ہے سوال
اے میرے ماہتاب! مجھے آفتاب لکھ

(انکشاف ذات)

تھا خطرۂ جاں میرے کمالات میں شامل
دیکھا ہے جو تم نے وہ تماشا بھی نہیں تھا

(تحیّر آمیزی)

اشیاء کی نگاہوں سے گرے جاتے ہیں
کس حال میں سکّوں کا چلن دیکھتا ہوں

(نوحۂ صارفیت)

لو اب یہ چاند ستاروں میں بھی نکل آئے
یہ آئینوں میں کہاں سے سما گئے پتھر

(تضادِ فطرت)

صدیاں ضرور لگ گئیں بےدار ہونے میں
تیرا غلام بن کے مگر حکمراں اٹھا

(اولُ العزمی)

پلٹ کے جب تلک میں اس پر اک نگاہ ڈالتا
ہوا کا زور میرے پاؤں کا نشان لے اڑا

(بےثباتی)

گر جوش میں آجائے تو کیا چیز ہے کشتی
کچھ ہوش کناروں کا بھی دریا نہیں رکھتا

(جنوں خیزی)

محولہ اشعار کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ غلام مرتضیٰ راہیؔ کی شاعرانہ ذہنیت میں جدید اور عصری حسیّت کے وہ سارے رموز و علائم اور انکشاف ذات کے پہلو نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں جو راہیؔ کی شاعرانہ ذہنیت کا اٹوٹ حصہ ہیں۔

اردو زبان و ادب کے اہم ناقد شمس الرحمٰن فاروقی کی غلام مرتضیٰ راہیؔ کے بارے میں یہ رائے ''ایسی عمر میں جب اکثر شاعر تھک کر بیٹھ جاتے ہیں غلام مرتضیٰ راہیؔ نئے مرحلے تسخیر کر رہے ہیں'' بے حد موزوں اور معنوی تہہ داری کا مظہر ہے۔ فاروقی کی اس رائے میں راہی کے شعری سفر کا ارتقا بھی دکھائی دیتا ہے اور سنِ شعور کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

فاروقی اس رائے کو پیش کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اکثر ایک دو مجموعے کی پیش کش کے بعد شاعر یا تو ہانپنے لگتا ہے یا پھر خود کو دہرانے لگتا ہے لیکن راہیؔ کے ارتقائی سفر پر چونکہ ان کی گہری نظر ہے اس لئے نہ راہیؔ خود کو دہرا رہے ہیں اور نہ تھک ہار کر بیٹھ گئے ہیں۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ راہیؔ قریب پندرہ برسوں تک خاموش ضرور رہے ہیں۔ لیکن اس کے بعد جس طرح سے وہ شعری ہنروری کو سرعت سے برتنے لگے اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں رہ گیا کہ اس بھاری خلا (Gap) کو وہ پُر کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ بات دراصل یہ بھی ہے کہ موزوں کلام کہنا ہی کافی نہیں ہے اس کے لئے شرطِ اوّلیں ہے کہ جگالی کئے ہوئے مضامین کو برتنے سے پرہیز کیا جائے اور تازگی کا احساس دلایا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ تازگی شاعر کی اپنی تازہ دمی پر ہی منحصر کرتی ہے کہ وہ کتنی دور کی کوڑی لانے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

غلام مرتضیٰ راہیؔ کی اردو شاعری میں تازہ کاری، تازہ دمی مشہور ہے۔ یہ بات ان کے مخالفین بھی قبول کرتے ہیں کہ راہیؔ آہستہ آہستہ ہی سہی ارتقا کی منزلیں طئے کرتے جارہے ہیں۔

معتبر نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کی رائے کی روشنی میں راہیؔ کی شاعرانہ ذہنیت کی تلاش میں حتی المقدور کامیاب ہوا ہوں یا نہیں اس کا اندازہ میرا تحقیقی مقالہ پڑھنے والے ہی لگا سکتے ہیں۔ راہیؔ کے درج ذیل اشعار میں اس غرض سے پیش کررہا ہوں تاکہ شمس الرحمٰن فاروقی کی رائے مستحکم ہوسکے۔

آسماں کے نیچے وہ رہتا ہے لیکن
بوجھ سے انکار کرنا چاہتا ہے

جھانکتے ہیں آسمانوں سے فرشتے
ایک بچہ ہاتھ میں شیشہ لیے ہے

تجاوز حد سے جب کرتا ہے دریا
کنارہ سب سے پہلے ڈوبتا ہے

اس کا بھی محافظ تو آخر کوئی ہوگا ہی
فانوس سے باہر جو اک شمع فروزاں ہے

چھپا تھا ہیرا کوئی راستے کے پتھر میں
ہماری ٹھوکروں نے اس کا انکشاف کیا

جھانکتا بھی نہیں سورج مرے گھر کے اندر
بند بھی کوئی دریچہ نہیں رہنے دیتا

اگلا سا مجھ میں شوق شہادت نہیں اگر
پہلی سی کاٹ بھی تری تلوار میں نہیں

آتا تھا جس کو دیکھ کے تصویر کا خیال
اب تو وہ کیل بھی مری دیوار میں نہیں
سبزے کی طرح میں نے بھی سر کو جھکا لیا
اب آندھیوں کو سر سے گذر جانا چاہیے
سرحد کی لکیر دیکھ آئے
خنجر کی طرح چمک رہی تھی
مجھ کو اک دیوار نے رکھا مشکل میں
رہتا تھا ہم سایہ بن کر اک سوال
اتر کے رہ گیا ہو جیسے کوئی خنجر سا
کھڑا ہے دشت کے پہلو میں اک شجر ایسا
جھپک گئی تھی گھڑی دو گھڑی کو آنکھ کہیں
سفر ہمارا اسی درمیان ختم ہوا
سب گھیر کر کھڑے ہوئے مجھ کو پھر اس کے بعد
حیران رہ گئے کہ تماشہ نہیں ہوں میں
جانے کن حیرتوں میں دم نکلا
منہ کھلے کے کھلے ہیں غاروں کے
مثال سنگ ہوں میں اس کی بے رخی کے سبب
سراپا آئینہ اس کی توجہات سے تھا
رکھ دی گئی تھی قدموں پہ اس کے اتار کر
دستار جانتی ہے کہ سر کون لے گیا

رکھ دیا وقت نے آئینہ بنا کر مجھ کو
رو برو ہوتے ہوئے بھی میں فراموش رہا

ترتیب سے حسن ہے جہاں کا
اک چیز اِدھر اُدھر نہیں ہے

جیسے چلتا ہوا آرا ہو، وہ دھارا دیکھوں
کٹ کر گرتا ہوا دریا میں کنارا دیکھوں

آپ ہی آپ جھٹک دیتا ہوں دامن اپنا
اُف مرا خوف! نہ جگنو نہ شرارہ دیکھوں

مجھ کو اسے گلزار بنانے کی پڑی ہے
صحرا میں بھی رہ کر مجھے وحشت نہیں آئی

محو ہم سے نہ ہوا اک لمحہ
لوگ صدیوں کو بھلا دیتے ہیں

بے تحاشہ جیے ہم لوگ ہمیں ہوش نہیں
وقت آرام سے گزرا کہ پریشانی سے

دل نے تمنا کی تھی جس کی برسوں تک
ایسے زخم کو اچھّا کرکے بیٹھ گئے

پہلے چنوا دیا اس نے مجھے دیوار کے ساتھ
پھر عمارت کو مرے نام سے موسوم کیا

معرکہ سخت تھا، لیکن مجھے سر کرنا تھا
جان پر کھیل گیا جان کے ڈر سے اب کے

****

باب نمبر ٦۔

غلام مرتضیٰ راہی کی غزلوں میں تشبیہات و استعارات کی انفرادیت

تشبیہات واستعارات صنفِ غزل کی روح سمجھے جاتے ہیں۔اس کی تعریف وتوصیف میں ناقدینِ ادب کی مختلف فکر ونظر ہے۔گارڈنر مرفی کے نظریے کے مطابق ہر انسان کے مہیجات مختلف ہوتے ہیں اور اسطرح علامتی ردِعمل میں بھی فرق نمایاں ہوتا ہے۔ایک مہیج جواشارات وکنایات اور تلازمے ایک فرد کیلئے فراہم کرتا ہے وہ دوسرے فرد کی شخصیاتی ساخت کے اعتبار سے مختلف ماہیت اختیار کر سکتے ہیں۔مرفی کے خیالات کی رو سے استعارہ ایک طرح کا اشارہ ہے۔جو کسی شئے یا کیفیت کے لئے مقرر کرلیا جاتا ہے۔جس کے پیچھے یہ نفسیاتی نکتہ بھی پوشیدہ ہوتا ہے کہ تقلیل ریاضت کی خاطر اور سہل پسندی کی بنیاد پر لامحدود معنیٰ کو محدود اور قابل دسترس بنالیا جائے۔

جارج وہیلے (George Whaley) کے مطابق ''استعارہ ان افکار و تصورات اور احساسات کے اظہار کا وسیلہ ہے جنہیں منطقی زبان ادا کرنے سے قاصر رہتی ہے۔''

سیّدہ جعفر نے اپنے مضمون ''انیس کے دو استعارے'' میں استعارے کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شاعری میں استعارے کے پیچھے یہ تصور کام کرتا رہتا ہے کہ جب کسی موصوف کے لئے کوئی مخصوص صفت ثابت کرنا ہو تو اس کو ایک ایسی شئے سے نسبت دی جائے جس میں وہی خصوصیت واضح طور پر اپنی مکمل

صورت میں موجود ہو۔دوسری یہ کہ استعارے میں کم الفاظ کے ذریعہ سے وسیع مطالب کی ترجمانی کی صلاحیت بھی موجود ہوتی ہے۔تشبیہہ کی بہ نسبت استعارے میں زیادہ ایجاز واختصار موجود ہوتا ہے۔جس کی وجہ یہ ہے کہ تشبیہہ میں نقطہ اشتراک یا نقاط تقابل کی دریافت کے ساتھ اشیاء کا ذکر بھی ضروری ہوتا ہے۔'' [1]

درج بالا آراء کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ استعارہ ایک ایسا اشارہ ہے جو کسی شئے یا فرد کے بدل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔اور تشبیہہ کسی دو شئے یا افراد میں مماثلت کا اظہار یہ ہے۔دراصل تشبیہات واستعارات غیر براہ راست طور پر شعری اظہار کے وسیلے ہیں جن باتوں کو ہم براہ راست کہنے سے اجتناب کرتے ہیں انہیں تشبیہ واستعارے کا جامہ پہنا کر سرعام کرنا تقویت بخش عمل ہوتا ہے۔تشبیہات و استعارات کا منظر سے گہرا رشتہ ہے اوران کی توضیحات میں منظر نگاری کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔لیکن شعری اصطلاح میں دونوں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔

عشرت ظفر نے تشبیہہ واستعارے کو تمثال سازی کی صنف قرار دیا ہے ان کے مطابق

''تمثال سازی ایک تہہ دار پیچیدہ عمل ہے اور یہ پیچیدگی الفاظ کی ہی نہیں بلکہ معنیٰ کی بھی ہے۔جس طرح کہ پردۂ سنگ میں تصویر پوشیدہ ہوتی ہے۔'' [2]

فارسی،اردو کے علاوہ ہندی میں بھی اسکا چلن عام ہو گیا ہے۔شاعری میں اسکی ترکیب سے شعری حسن پیدا کیا جاتا ہے۔اور جس کی منظر کشی کی جاتی ہے اس کا پورا پورا عکس اس استعاراتی الفاظ میں آویزاں ہوتا ہے۔یہ قاری کے شعر فہمی پر منحصر کرتا ہے کہ اس کا ذہن اسے کس حد تک تسلیم کرنے پر قادر ہے۔

یہاں استعارے اور تشبیہات کے موضوع پر بحث کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ

---

1. سیدہ جعفر کا مضمون۔''انیس کے دو استعارے۔ماہنامہ آج کل' جنوری ۱۹۸۲ء

2. حرف باریاب۔عشرت ظفر

غلام مرتضیٰ راہی کی غزلوں میں تشبیہات واستعارات کی انفرادیت کو تلاش کرنا ہے۔
غلام مرتضیٰ راہی نثری ٹکڑے سے استعارے کی تخلیق کرتے ہیں۔ دو لفظوں کے اتصال سے نیا مفہوم پیدا کرنے میں انکی مہارت دیکھتے بنتی ہے۔استعارے کی تخلیق کرتے وقت راہی بھاری بھرکم اضافت کا استعمال نہیں کرتے بلکہ لفظوں کے معمولی ہیر پھیر سے جہان معنی پیدا کرتے ہیں۔مثال کے طور پر۔

کیسا انساں ترس رہا ہے جینے کو
کیسے خشکی پر اک مچھلی زندہ ہے
اگر ہو زخم کھانے والا کوئی
قلم کی نوک ، برچھی کی انی ہے

درج بالا پہلے شعر میں انسان کے وجود کو خشکی پر ایک زندہ مچھلی سے تشبیہہ دی گئی ہے۔خشکی حیاتِ ماہی کی ضد ہے۔ خشکی پر زندہ مچھلی کا تصور ہی ممکن نہیں۔پانی میں اس کی زندگی پوشیدہ ہے۔پانی سے ہٹنا اسکی موت کا پیغام ہے۔انسان کا اس عہد میں یہی المیہ ہے۔اس کی حیات کا بھی دامن تنگ ہوتا دکھ رہا ہے۔خشکی پر مچھلی کا ہونا سخت عذاب میں مبتلا ہونے کے مترادف ہے بس یہی کیفیت عہد رواں میں انسانی وجود کی بھی ہے۔یہاں شاعر نے انسانی وجود کو خشکی پر زندہ مچھلی سے تشبیہ دے کر شعری حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔دوسرے شعر میں قلم کی نوک کو برچھی کی انی کہا گیا ہے۔یہاں 'زخم کھانے والا' سے مراد حساس طبیعت انسان لیا گیا ہے۔قلم کی نوک کی نشتریت برچھی کی انی سے زیادہ چبھتی ہے۔اگر طبیعت کی حساسیت زندہ ہو۔

سبزے کی طرح میں نے بھی خود کو جھکا لیا
اب آندھیوں کو سر سے گذر جانا چاہیئے

یہاں 'سبزہ' انکساری اور خاکساری کے طور پر استعمال ہوا ہے۔سبزے میں اتنی لچک

ہوتی ہے کہ آندھیوں کا گذر اس کے سر سے باآسانی ہو جاتا ہے۔ یہ سبزے آندھیوں کی راہ میں مزاحمت پیدا نہیں کرتے۔ یہاں خاکساری کے اظہار کے لئے لفظ 'سبزہ' اتنا مناسب اور برجستہ ہے کہ معنوی اعتبار سے کوئی دوسرا لفظ اتنا بلیغ و بسیط معنیٰ فراہم نہیں کرسکتا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ راہیؔ کے اشعار میں جو پیکر تراشی ہے وہ بالکل سامنے کی چیز ہے۔ ان کے یہاں شعری افکار کی رفعت کی خاطر جو تشبیہ و استعارے گڑھے جاتے ہیں اس سے قاری پہلے سے مانوس ہوتا ہے۔ لیکن ان کی مشاہداتی نگاہ اس حقیر لفظ کو بلیغ معنیٰ کے روپ میں دیکھتی ہے۔ بظاہر سہل دکھنے والا لفظ جب انکے شعری پیکر کا حصہ بن جاتا ہے تو عمیق مطالعہ کا باب ہو جاتا ہے۔

رہے گا آئینے کی طرح آب پر قائم
ندی میں ڈوبنے والا نہیں کنارہ مرا

آئینہ صاف وشفاف اور ہو بہو پیکر تراشی کا مظہر ہے۔ یہاں کنارہ سے مراد رواں کیفیت ہے یعنی اس کیفیت کی سرشاری آئینے کی طرح برابر قائم رہے گی۔ اب ترمیم وتبدیلئ حالات کا تصور بے محل ہے۔ راہیؔ نے ندی میں ڈوبنے والا کنارہ کی ترکیب سے دکھ کا سیلاب بہا دیا۔ شاعر کو حدّ نظر تک غم کا سیلاب پھیلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ان کا غم اس ندی کی طرح ہے جس کا کنارہ نہیں ہے۔ شاعر کا انداز پیشکش واضح اور حسین ہے۔ ان کی شاعری استعاراتی کیفیت سے مزّین ہے۔ راہیؔ نے اپنے ایک شعر میں سراپائے محبوب کا عکس اس طرح پیش کیا ہے۔

اس کی پرچھائیں نے پانی میں اترنا چاہا
دیکھنے کے لئے دریا نے ٹھہرنا چاہا

اس شعر میں راہیؔ نے غیر براہ راست طور پر اپنے محبوب کے سراپا کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس شوخ کا دریا کے کنارے سے جب گذر ہوا تو اس کی

پرچھائیں نے پانی کی لہروں میں رنگینی بکھیر دی اور پانی اتنا دلکش و دیدہ زیب ہو گیا کہ دریا بھی اس خوش رنگینیوں میں محو ہو گیا اور اپنی روانی کو چند ساعتوں کے لئے روکے رکھا۔

شاعر اس شعر میں اک نئی طرح کی لذّت محسوس کر رہا ہے۔ محبوب کا عکس پانی میں دیکھ کر دریا کی روانی کا رک جانا ایک زمانے کا ٹھہر جانا ہے۔ یعنی اس کی خوبصورتی اس قدر دلفریب مناظر کو جنم دیتی ہے کہ پورا عالم اس کی تسخیر کے خواب دیکھنے لگتا ہے۔ کوئی معمولی شاعر ہوتا تو محبوب کے اجزائے جسمانی کی تعریف و توصیف میں آسمان کے قلابے ملا دیتا لیکن کسی عضو کی ثنا خوانی کے بغیر محبوب کے پورے سراپے کا جائزہ پرچھائیں اور دریا کے حوالے سے کرنا زبردست فنکاری ہے۔ یہی دلکش انداز پیشکش راہیؔ کی شناخت کا وسیلہ ہے۔ راہیؔ کی تشبیہاتی قوتِ متخیلہ کو اور مستحکم کرنے کے لئے ان کی ایک مکمل غزل پیش کی جاتی ہے۔

کھانا ہر اک موج کا وہ پیچ و تاب سا
وہ سطح آب پر مرا رہنا حباب سا
مدّت میں میری آنکھ کا کھلنا ہوا کہیں
اب جو بھی دیکھتا ہوں وہ لگتا ہے خواب سا
اتنے فریب کھائے ہیں میں نے کہ اب مجھے
دریا کہیں ملا تو لگے گا سراب سا
دستک سی کوئی ہوتی ہوئی دور دور تک
کھلتا ہوا کہیں نہ کہیں کوئی باب سا
اٹھنے سے بلبلوں کے گذرتا ہے یہ گمان
لیتا ہوا سانس جیسے کوئی زیر آب سا

دراصل یہ پوری غزل میر تقی میرؔ کی ایک مشہور و معروف غزل سے مشابہ

ہے۔ میر کی غزل یوں ہے۔

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے
نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں
حالت اب اضطراب کی سی ہے
میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اُسی خانہ خراب کی سی ہے
میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

راہی کی غزل کے پہلے شعر میں کلیدی لفظ حباب ہے۔ حباب فنائیت کا استعارہ ہے۔ پانی پر حباب کا وجود فقط چند ساعتوں کا مہمان ہوتا ہے۔ یوں تو حباب دیکھنے میں خوشنما اور پرکشش ہوتا ہے۔ موجوں کی تھپیڑوں کا زور اور سطح آب پر حباب کا رہنا زندگی کی فنائیت کی طرف اشارہ ہے۔ کوئی لاکھ اس سے اعتراض کرے لیکن حق تو یہ ہے کہ وجود کائنات پانی کے بلبلے کی طرح ہے۔ دوسرے شعر میں خواب کو استعاراتی پیکر بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ خواب جو کہ حقیقت کی ضد ہے۔ مدّتوں بعد جب شاعر کی آنکھ کھلتی ہے تو دنیا کا نقشہ ہی بدلا ہوا ملتا ہے۔ دنیا خواب کی طرح معلوم ہوتی ہے۔ جس کی تعبیر کا سلسلہ نفی پر ختم ہوتا ہے۔ تیسرے شعر میں سراب کو کلیدی لفظ بنایا گیا ہے۔ جس کا معنی ہے دھوکا۔ فریب کاری تو فیشن کا حصہ بن گئی ہے۔ آج کے اس دورِ ترقی میں جو کسی کو جتنا فریب دے سکے وہ اتنا ہی ماڈرن کہلانے پر فخر کرتا ہے۔ اس گلوبلائزیشن میں قدم قدم پر دھوکا ہے، سب

کچھ مصنوعی ہے۔ اخلاقی ،سماجی ،خونی ،سبھی رشتے مصنوعی ہو گئے ہیں اس لئے شاعر کہتا ہے کہ زندگی کے ہر مرحلے پر فریب کاری کا سامنا ہوا ہے۔ اب اتنے فریب کھا چکے ہیں کہ یقین کا گمان بھی ذہن ودل سے پرے ہے۔ دریا بھی مل جائے تو سراب کا ہی گمان ہوتا ہے۔ چوتھا شعر بڑا تجرباتی اور اپنے اندر دُکھ کی ایک کائنات سمیٹے ہوئے ہے۔ غلام مرتضیٰ راہیؔ کی شاعری کا ایک اہم وصف یہ بھی ہے کہ وہ ان موضوعات کو اپنی شاعری کا حصہ بناتے ہیں جس پر بہتوں کی نگاہِ بصیرت پہنچ نہیں سکتی۔ رات کے سنّاٹے میں دور سے دستک کی آتی ہوئی پُر درد آواز کا سماعت سے ٹکرانا پورے اعصاب کو تھرّا دینے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ ایسے میں مدد کے لئے کھلنے والے باب کسی روشن ضمیر بزرگ کے دربار کی طرح ہوتے ہیں۔ اور اگر ان صداؤں کا کوئی مداوا نہ ہوا تو ایک ذکی الحس انسان کے ذہن ودل پر اضطرابیت کی لہریں اسکی نیند حرام کرنے کے لئے کافی ہوتی ہیں۔

آخری شعر بھی بلیغ معنیٰ رکھتا ہے بلبلوں کے بار بار اُٹھنے سے اس صداقت کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ زندگی زیرِ آب بھی سانس لے رہی ہے اسے بھی خدا کی جانب سے رزق مل رہا ہے۔

ان تمام محولہ اشعار کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ غلام مرتضیٰ راہیؔ غزل کی دنیا کا ایسا سپہ سالار ہے جو اپنے شعری لشکر کو استعاراتی پیکر کی اُڑان عطا کرتے ہوئے آسمان کی خلاؤں میں گم نہیں ہوتا بلکہ ارضی اور بہت سامنے کی چیز کو ایسی زبان بخشتا ہے کہ وہ فرسودگی کے لیے تیز تلوار بن جاتی ہے۔

غلام مرتضیٰ راہیؔ نے اپنے شعری تلازمے کو جن استعارے وتشبیہات کے گہر سے سجایا وسنوارا ہے وہ آج کے بنیادی احساسات سے مملو ہیں۔ الفاظی بندش اور نئے استعارے گڑھنے کی بے وجہ بدعت سے راہیؔ نے گریز کیا ہے۔ ان کی شاعری کا مثبت پہلو یہ ہے کہ ان کے یہاں واقعات وسانحات کی مناسبت سے تشبیہ واستعارے

گڑھے گئے ہیں نہ کہ تشبیہ و استعارے کی وجہ سے واقعات کا وجود ہوا ہے۔راہی لفظیات کو برتنے میں کبھی بھی الفاظ کے محتاج نہیں رہے بلکہ اپنے شعری لوازمات کے مطابق الفاظ کو اپنا گرویدہ بنا کر رکھا اور جب، جہاں جس خانے میں انہیں فٹ کیا وہ اس کا مکمل جزو ثابت ہوا۔پروفیسر ڈاکٹر اصغر عباس نے راہی کی شاعری کے جس حسن کی طرف اشارہ کیا ہے وہ ہماری تحقیق کی تصدیق کرتا نظر آتا ہے۔اصغر عباس فرماتے ہیں

''انہوں نے اردو غزل کی علامتوں اور تشبیہوں کو اپنے اور آج کے بنیادی احساسات سے نئی شکل اور قوت عطا کی ہے۔یہ علامتیں اور تشبیہیں طلسمات و رنگ کی ایک دنیا بن گئی ہیں اور اس لئے آج کے شعراء کی صف میں انہیں ممتاز حیثیت حاصل ہے۔''اس سلسلے میں غلام مرتضیٰ راہی کے درج ذیل اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

پلٹ کے جب تلک میں اس پر نگاہ ڈالتا
ہوا کا زور میرے پاؤں کا نشان لے اُڑا
اگر کہیں کوئی دیوار سامنے آئی
بلند ہو گیا پانی کا حوصلہ کچھ اور
جوجھتے جوجھتے لہروں کو ہوئی فتح نصیب
ٹوٹتے ٹوٹتے دریا کا کنارہ نہ بچا
نہیں ڈوبے گا تنکے کا سہارا چاہنے والا
ندی کو پار کر لے گا کنارہ چاہنے والا
ساقیِ وقت کا پایا جو اشارہ راہی
لوگ شیشوں پہ برسنے لگے پتھر کی طرح

محولہ بالا اشعار میں دورِ حاضر کے نوحے مختلف انداز فکر میں پیش کئے گئے ہیں۔پلٹ کر نگاہ ڈالتے ہی ہوا کے زور سے پاؤں کے نشان کا مٹ جانا، پانی کے

حوصلے کا بلند ہونا، لہروں کا جوجھنا اور مسلسل ردِ عمل سے دریا کے کنارے کا ٹوٹنا، تنکے کا سہارا، شیشوں پہ برسنے کا عمل یہ سبھی ایسے استعارے گڑھے گئے ہیں جو حالاتِ حاضرہ کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ ایسے سینکڑوں اشعار ان کے مجموعۂ کلام کی زینت بنے ہوئے ہیں جنہوں نے شعر کی تہہ میں نشتریت کی ہے۔ ذہن و دل کو جھنجھوڑا ہے۔ گجرات کے فساد کے حوالے سے انکے اشعار اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہیں۔

اے آفتاب ! کہاں سر چھپائے اب کوئی
کہ سائبان میں ہے دھوپ کو قیام کی چھوٹ
ولیؔ کے قبضے میں دو گز زمیں تھی جس کے لئے
روا ہوئی گڑے مردے سے انتقام کی چھوٹ
مدافعت سے کم اتلافِ جاں کا ہوتا ہے
محافظوں نے مگر دی نہ انکو نام کی چھوٹ
یہی گھڑی ہے کہ تاریخ خود کو دہرا لے
کہ روز روز نہیں ملتی قتلِ عام کی چھوٹ

غلام مرتضیٰ راہیؔ نئے نئے استعارے برتنے میں بڑے محتاط واقع ہوئے ہیں انہوں نے فیشن زدگی کی لہروں میں خود کو رواں دواں نہیں کیا بلکہ اپنے شعری دروبست میں ہمیشہ ایک توازن برقرار رکھا۔ فرسودہ علامات، تشبیہات و استعارات سے اجتناب کرتے ہوئے اپنی شاعری میں ایک غضب کی کاٹ پیدا کی۔ یہی امتیاز انہیں اپنے معاصرین میں انفرادیت بنائے رکھنے میں معاون ثابت ہوا۔ مصورؔ سبزواری نے راہیؔ کی شاعری سے متعلق اپنی رائے ان لفظوں میں پیش کی ہے۔

''راہیؔ کے یہاں بعض بزعم خود جدید شعرا کے مکتبی اندازِ فکر اور نئے کلاسیکی ادب کی آڑ میں ماضی قریب کی فرسودہ علامات واستعارات کے برعکس ایک اپنا انداز

اور اہتمامِ فکر ہے اور وہ ہے خوف، ترحم کے جذبات کو بروئے کار لا کر جذبے کے داخل اور خارج کا ردِ عمل'' ۱؎

تحقیق سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ راہی کی شاعری فقط لفظیات کی شاعری نہیں ہے بلکہ قلب ماہیت کی سچی روداد ہے جسے انہوں نے تشبیہات و استعارات کا جامہ پہنا کر شعری حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ اور یہ بھی حق ہے کہ فرسودگی سے انہوں نے اپنا دامن پاک رکھا ہے۔ انکی شاعری میں پھوہڑ پن کا عنصر دور دور تک مفقود ہے انہوں نے صالح ادب اور صاف ستھرے استعاروں سے صاف ستھری شاعری کی ہے۔ جس سے انکی صالح طبیعت کا پتہ چلتا ہے۔ مثال کے طور پر انکے یہ اشعار۔

کیا رکھتے اپنی صورت حالات پر نظر
ہر شیشے میں کہیں نہ کہیں کوئی بال تھا

مرے وجود میں آجائیں مہر وماہ و نجوم
اے آسمان کبھی ٹوٹ کر بکھر مجھ میں

مانا کہ بازوؤں میں بہت زور ہے مگر
جب سرخ ہو سلاخ تبھی اس کو موڑیئے

قدم اپنے ملا کر تیز پانی سے
ہماری ناؤ چلتی ہے روانی سے

ملاح بن کے میں نے گزاری ہے زندگی
پانی پہ داستاں میری تحریر ہو گئی

جب جوش میں آجائے تو کیا چیز ہے کشتی
کچھ ہوش کناروں کا بھی دریا نہیں رکھتا

۱؎ 'لاکلام' کی غزلوں پر مصور سبزواری کی رائے

یہاں شیشے میں بال کا ہونا ایک محاورہ ہے جس کا استعمال ہمارے ادباء شعراء اپنے مضامین وشعری مبادیات میں دھند کے معنیٰ میں کیا کرتے ہیں۔ یہاں شیشے سے مراد اجتماعیت لیا گیا ہے۔فرد اپنی صورت حالات کا جائزہ لے کر خود میں تبدیلی کے امکان روشن نہیں کرسکتا ہے کیوں کہ جس معاشرتی زندگی کا وہ پروردہ ہے اسکی حالتِ غیر کافی افسوسناک ہے۔کہا جاتا ہے کہ صحت مند معاشرہ صحت مند ذہن کا مبلغ ہوتا ہے جب پورا معاشرۂ فلک ہی گنجلک ہوتو رخِ ماہتاب بھی دھندلا نظر آتا ہے۔یہاں انہوں نے بڑی چابکدستی سے پورے سماج ومعاشرے کو کٹہرے میں کھڑا کردیا ہے۔راہیؔ کے استعاراتی نظام کا یہ بڑا وصف ہے کہ وہ کھل کر تو نہیں کہتے لیکن اشارے کنائے میں ایسی ضرب لگا جاتے ہیں جسکی چوٹ کا احساس دیرپا ہوتا ہے۔

دوسرے شعر میں آسمان کلیدی لفظ ہے آسمان جو اپنے دامن میں مہر وماہ وانجم سمیٹے ہوئے اپنی قسمت پر نازاں ہے کبھی تو ٹوٹ کر بکھرے کہ یہ مہر وماہ وانجم اس کے قبضے سے آزاد ہوکر عام زندگی کے چہرے کو روشن وتابناک کرے۔آسمان اس شخصیت ونظام کی طرف اشارہ ہے جس نے ساری دنیا پر اپنی اجارہ داری قائم کررکھا ہے۔

تیسرے شعر میں راہیؔ نے وقت کی قدر وقیمت کو اجاگر کیا ہے۔سلاخ کے گرم ہونے پر اسے موڑنے کی صلاح زمانے کی انگلی پکڑ کر چلنے کے مترادف ہے۔

چوتھے شعر میں 'پانی' وقت کا استعارہ ہے اور ناؤ گردشِ ایام کا اشاریہ۔ پانی کی روانی کے ساتھ ناؤ کا تیز گام ہونا منزل مقصود کی طرف گامزن ہونا ہے۔پانی بہت خوبصورت اور جدید ترکیب ہے۔پانچویں شعر میں پانی کے ساتھ وابستگی ملاّح کو پہچان عطا کرتی ہے یہاں بھی پانی وقت یا زمانے کی تمثیل ہے۔وقت کے شانہ بشانہ چلنے والا راہ گیر کبھی راہ سے بھٹک نہیں سکتا۔وقت کی قدر کرنے والا وقت کا سکندر ہوتا ہے۔

چھٹے شعر میں دریا انسان کی ازلی کمینگی کے طور پر استعمال ہوا ہے۔دریا یوں تو

بڑے کار آمد ہوتا ہے پورے خطۂ ارض کی سیرابی کا ضامن ہوتا ہے۔کشتیاں اتھاہ بوجھ لے کر اس کے سینے پر سے گزر جاتی ہیں وہ اپنی لہروں سے اسے کنارے تک پہنچاتا ہے۔یہی دریا کبھی تفریح طبع کا سامان بھی فراہم کرتا ہے۔لیکن جب جوش میں آتا ہے تو پھر کسی کی پرواہ کئے بنا اپنا کام کر جاتا ہے۔کشتیوں کو غرقاب کر دیتا ہے یہاں تک کہ کنارہ جو اسکے وجود کا حصہ ہے اس کے چہرے کو مسخ کرنے سے باز نہیں آتا۔بس یہی کیفیت انسان کی ہے وہ بظاہر بہت سادہ لوح اور مونس ہوتا ہے لیکن جب اسکے اندر کی شیطانیت جاگ اٹھتی ہے تو سارے آداب واحترام کے حجاب کو چاک کر دیتا ہے اور ایسے کام کر جاتا ہے جس سے انسانیت شرمسار ہو کر رہ جاتی ہے۔

غلام مرتضٰی راہیؔ کی شعری عمارت مروجہّ الفاظ کے ستون پر ٹکی ہوئی ہے۔انہوں نے غبار،آئینہ،چاند،ستارے،پتھر،زمین،دیوار،پانی وغیرہم کو استعاراتی پیکر کے طور پر پیش کیا ہے۔بظاہر یہ الفاظ سیدھے سادے معلوم پڑتے ہیں لیکن یہ اپنے اندر ایک بلیغ و بسیط جہانِ معنی چھپائے ہوئے ہیں۔یہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔مناظر عاشق ہرگانوی اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں کہ

''غلام مرتضٰی راہیؔ کی غزلوں میں زمین کو خاص اہمیت حاصل ہے۔وسیع و عریض ارضی کینوس پر انہوں نے مشاہدات و تجربات کے ذریعہ مختلف زاویئے سے حیات و کائنات کی رنگ آمیزی کی ہے۔انہیں اس بات کا احساس ہے کہ مٹّی سے انسانی زندگی کا ازلی اور ابدی رشتہ ہے اور یہ مٹّی زمین سے مہیاّ ہوتی ہے اور زمین وہ محور ہے جس پر انسان گردش کرتا رہتا ہے۔سانسوں کے اتار چڑھاؤ کو گنتا رہتا ہے اور اپنے پاؤں جما کر پونجی پیدا کرتا ہے اور اسے گنوا کر خالی ہاتھ آسمانی سفر پر روانہ ہو جاتا ہے۔انکے یہاں زمین زندگی کی علامت ہے'' [1]

---

[1] راہیؔ کی شاعری کے حوالے سے مناظر عاشق ھرگانوی کی رائے

اس حوالے کی تصدیق کے لئے انہوں نے راہیؔ کے چند اشعار بھی پیش کئے۔

جو رکھا تھا زمیں پر مرا پہلا قدم تھا
پڑا ہے چاند پر جو مرا اگلا قدم ہے

گل ، سخت زمینوں میں کھلانے کا نتیجہ
بھنوروں کا ادھر بھول کے پھیرا نہیں لگتا

گرا زمین پہ تو حیران کر گیا وہ بھی
جو آئینہ بھی نہیں تھا بکھر گیا وہ بھی

اب سنبھالے سے سنبھلتا نہیں انسان کا بوجھ
اب کھسکتی ہے زمیں پاؤں جہاں رکھتا ہے

رہا ہمیشہ ہمیں ایک دوسرے کا خیال
اسے زمیں سے مجھے آسماں سے کام رہا

جب زمیں پر نہیں چلتا راہیؔ
پاؤں کے نیچے دری رہتی ہے

غلام مرتضٰی راہیؔ کا مشاہداتی تیور اس کائنات کی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے جس کی ایک طرف کا چہرہ تابناک تو دوسری جانب کا غبار سے اٹا ہوا ہے۔ تیز رفتار گھوڑے کے گزر جانے کے بعد گھوڑا دھندلکے میں ایسا گم ہو جاتا ہے کہ اسکے وجود کا اتا پتہ باقی نہیں رہتا۔صرف اس کے ٹاپوں کی آواز فضاؤں میں گشت کرتی سنائی دیتی ہے۔ یہ غبار اس کے وجود کو اپنے دبیز پردے میں ایسا ڈھک لیتا ہے کہ اس کا نقش قدم بھی صاف دکھائی نہیں دیتا۔ دراصل غبار ایک پریشان کن مرحلے کا جیتا جاگتا استعارہ ہے جسے غلام مرتضٰی راہیؔ نے بڑے حسن وخوبی کے ساتھ اپنے شعروں میں برتا ہے چند اشعار مثال کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔

پسِ غبار مجھے کچھ نظر نہیں آیا
حروف سارے ہی غائب تھے روشنائی تھی
ہوا ہوں جب سے میں صحرا کی وسعتوں میں گم
غبار اُٹھا ہے نہ کوئی سوار نکلا ہے
دور و نزدیک کوئی نقش قدم ہے نہ غبار
جانے کس راہ سے ہو کر کوئی گزرا ہوگا
نکل گیا ہے دھول جھونک کر ہماری آنکھ میں
بجائے خود غبار تھا ، غبارِ کارواں نہ تھا
غبار چھٹنے تلک انتظار کر لیتے
دکھائی دیتا تمہیں اوج پر ستارہ مرا

'غبار' کا استعمال انہوں نے بغض وعناد کے لئے بھی کیا ہے۔عام بول چال میں غبار کا دھل جانا یعنی بغض کا ختم ہو جانا ہے۔راہیؔ نے بھی غبار بمعنی بغض و کینہ ہی اپنے شعروں میں استعمال کیا ہے لیکن اسکا کینوس بڑا وسیع تر ہے جوان کے اشعار کے مطالعہ کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔

تمام گرد و غبار دل سے نکل چکا تھا
برس چکا ابر اشک کھل کر تو میں نے دیکھا
اک آبشار لب کو ہسار نکلا ہے
اک ایک سنگ کے دل کا غبار نکلا ہے
بہا جو خون اسے مشق انتقام سمجھ
ابھی کہاں میرے دل کا غبار نکلا ہے

بغض انسان کی فطرت کا ایک جز بن گیا ہے۔دل کا غبار خون کے بہانے

سے بھی نہیں نکلتا۔ ظاہری اخلاق و اطوار سے بغض و حسد کی دبیز پرتیں چھٹ نہیں سکتیں بلکہ اس کے لئے اشکِ ندامت کا کھل کر بہنا ضروری ہے۔

راہی کے شعروں میں آئینہ حق کا اور پتھر باطل کا استعارہ ہے ان کے یہاں باطل سے حق کی طرف مراجعت کا رجحان ملتا ہے۔ ابر باطل کے زیر سایہ پروان چڑھنے والی دنیا میں جب حق کا پیامبر آیا تو پوری دنیا اسکی روشنی سے جگمگا اٹھی۔ انسانی شعور جاگ اٹھا۔ مردہ رگوں میں زندگی دوڑنے لگی گویا کہ پوری کائنات میں ایک بڑا انقلاب آ گیا۔ اسی کیفیت کا اظہار راہی نے اپنے ان شعروں میں کیا ہے۔

ہر رخ سے کھڑے ہیں روبرو ہم
آئینہ ہے بارگاہ تیری

کالک مل دو آئینوں کے چہروں پر
میری صورت کرتی ہے حیران مجھے

اس اعتماد سے مت دیکھ آئینے کی طرف
بجائے خود ہے رخِ آگہی فریبِ کمال

عکس تغیرّات سرِ آئینہ نہ پوچھ
تھی مجھ میں تابِ دید جو میں دیکھتا رہا

ساقیِ وقت کا پایا جو اشارہ راہی
لوگ شیشوں پہ برسنے لگے پتھر کی طرح

جلوے ہی جلوے ہیں میرے پیش نظر
پہلے میں پتھر تھا اب آئینہ ہوں

آخر میں بے نقاب سرِ آئینہ ہوا
صورت سے میری کون نہیں آشنا ہوا

آئنہ آئنہ روشن ہیں خد و خال مرے
دیکھنے والوں کا پتھر کا کلیجہ ہوگا

غلام مرتضیٰ راہی کی شاعری میں جو تشبیہات واستعارات کے تانے بانے بنے گئے ہیں وہ بظاہر تو معمولی ہیں لیکن اپنی قوتِ متخیلہ سے راہی نے انہیں غیر معمولی بنا دیا ہے۔ان میں وہ سحر انگیزی بھردی ہے کہ عام قاری اس سے مسحور ہوئے بنا نہیں رہ سکتا۔ تشبیہات واستعارات کے برتنے میں دیگر شعراء سے راہی الگ تھلک معلوم ہوتے ہیں یعنی ان کے لب و لہجے میں ایک انفرادیت جھلکتی ہے۔اردو کے مشہور ومعروف ادیب وناقد ڈاکٹر اسمٰعیل آزاد فتحپوری کی رائے اس امر کی تائید کرتی ہے انکا کہنا ہے کہ

''راہی کے یہاں تشبیہات سے زیادہ استعارات ہیں وہ کنایات و رموز تعریض سے خاص وابستگی رکھتے ہیں اور علامات کا استعمال ایک خاص طرز اور منفرد طریقے سے کرتے ہیں۔ان کے لب ولہجے میں ایک نمایاں انفرادیت ہے۔انفرادیت میر وغالب واقبال کے یہاں بھی ہیں لیکن راہی کی انفرادیت متذکرہ بالا ابطال شعروسخن سے الگ لب ولہجہ کی حامل ہے اس لئے ان کے یہاں طرح داری ،تہہ داری اور معنویت بالکل نئے خد و خال لئے ہوئے ہے۔ان کی تشبیہات جامد اور ساکت و صامت نہیں بلکہ متحرک دمدار فعال بولتی ،چہکتی ،ہر لحظہ رواں اور ہر دم جواں ہیں۔''[1]

راہی کا ایک شعر جس سے ان کے لب و لہجے کی انفرادیت صاف طور پر جھلکتی ہے شعر یوں ہے۔

وقت کہاں تک میری خاک اُڑائے گا
میں تو لپٹا ہوں مٹی کی چادر سے

غلام مرتضیٰ راہی نے اپنے شعری اظہار میں زمینی سچائی کو اوّلیت بخشی ہے۔

---

[1] غلام مرتضیٰ راہی عہد حاضر کا ایک قابل قدر شاعر۔ڈاکٹر اسماعیل آزاد فتحپوری

مٹی کی چادر سے لپٹنا خاکساری کو ظاہر کرتا ہے۔راہی کے اسی نظریئے کی تصدیق ولیم ورڈس ورتھ کی ایک نظم **He that is down needs fear no fall** سے ہو جاتی ہے۔جو انسان خطِ افلاس کی انتہا تک پہنچ چکا ہوا سے اور نیچے جانے کا خطرہ نہیں ہوتا۔منور رانا کا یہ شعر راہی کے اس نظریئے کی ترجمانی کرتا ہے۔

سو جاتے ہیں فٹ پاتھ پہ اخبار بچھا کر
مزدور کبھی نیند کی گولی نہیں کھاتے

راہی کے متعدد اشعار ان کی اس فکر کی تائید کرتے نظر آتے ہیں۔

دابے سے کہیں دبا ہے سبزہ
اس میں زور نمو بہت ہے

میں اپنی جان ہتھیلی پہ رکھ کے چلتا ہوں
اب اس سے بڑھ کے کوئی مجھ سے اور کیا لیگا

راہی نے لفظ 'دیوار' کو اپنے شعروں میں جگہ جگہ استعمال کیا ہے۔راہی کی خصوصیت ہے کہ وہ لفظ کو نیا پیرہن بخشتے ہیں۔انکے یہاں معنی ومفہوم کو بلیغ کرنے کیلئے درجۂ تخیل کو بلند کرنے کی کوشش میں حیرت ناکی پیدا ہو جاتی ہے۔عام ڈگر سے ہٹ کر لفظوں کے استعمال سے شاعری میں جو تازگی اور ندرت پیدا ہو جاتی ہے اس کی لذت ذہن کو مسرور کرتی رہتی ہے۔دیوار کے حوالے سے ڈاکٹر سید یحیٰی نشیط کا ایک وقیع مضمون ''دیوار۔۔۔غلام مرتضیٰ راہی کے کلام میں'' کا ایک اقتباس نقل کرتا ہوں۔

''غلام مرتضیٰ راہی نے لفظ 'دیوار' کو سو طرح سے باندھا ہے اور اس انداز سے کہ اس پامال لفظ سے شعری حسن نکھر آیا ہے۔اور لفظ کی معنوی خوبی دو چند ہوئی ہے۔راہی کی غزلوں میں فن کی تازہ کاری، افکار کی تہہ داری اور تخیل کی بلندی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ان کے یہاں غزل کے اشعار میں جذبات کا تموج معنی کی زیریں

لہروں میں پایا جاتا ہے۔سطحِ شعر کا سکوت البتہ انکے افکار کی گہرائی کا پتہ ضرور دیتا ہے۔ راہیؔ کی شاعری کا انداز ان حقائق کا کاشف ہے کہ وہ حوادث دوراں سے غیر آشنا نہیں ہیں بلکہ تجربے کی بھٹّی سے تپ کر نکلے ہیں۔'' ١

راہی نے 'دیوار' کو ایک استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے یہ کبھی مزاحمت بن کر سامنے آئی ہے تو کبھی مذہب کی تنگ نظری کو ظاہر کرتی ہے۔کبھی سائے کے طور پر تو کبھی ہمسایہ بن کر، کبھی سہارے کے طور پر تو کبھی مصالحت کے معنی میں دیوار کا استعمال ہوا ہے۔ دیوار کبھی مثبت تو کبھی منفی پہلو کو اجاگر کر رہی ہے۔دیوار کا استعمال انا کے معنی میں بھی ہوا ہے۔راہیؔ کی شعری تفہیم میں سحر کی سی کیفیت موجود ہے۔وہ ایک ہی لفظ سے کئی معنی پیدا کرنے کا ہنر رکھتے ہیں۔دیوار کے تعلق سے انکے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

جو ہم نے رخنۂ دیوار چھوڑ کر رکھا تھا
نظر اسی سے وہ صورت کبھی کبھی آئی

(سہارا)

مجھکو اک دیوار نے رکھا مشکل میں
رہتا تھا ہمسایہ بن کر ایک سوال

(ہمسایہ)

انا کو کر لیا دیوار کی طرح حائل
پھر اس کے دونوں طرف دونوں بے قرار رہے

(انا)

دونوں کا اختلاف اگر دور ہو سکے
دیوار ایک دوسرے کے درمیاں اُٹھا

(مصالحت)

---

١ 'دیوار'۔غلام مرتضٰی راہیؔ کے کلام میں۔ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط

ہم نے کیں ایسی بھی دیواریں کھڑی
جن کو لے کر دوسروں کے گھر بنے

(مثبت)

ہم کناروں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے
پاٹ دریائے انا کا درمیاں رکھتے ہوئے

(انا)

یاروں نے میری راہ میں دیوار کھینچ کر
مشہور کر دیا کہ مجھے سایہ چاہیئے

(منفی)

گرتی ہوئی دیوار ہوں اب اسکی نظر میں
اب وہ میرے سائے سے پریشان رہے گا

(مزاحمت)

تشبیہ و استعارات کے معاملے میں راہی کا رویہّ لفظ ومعنی کے بیچ متصادم کیفیات کو اجاگر کرنے کے لئے مصور سبزواری کی طرح ثقیل الفاظ کا مرکب دکھائی نہیں دیتا ہے بلکہ کیفیت کو دو آتشہ بنانے کے لئے وہ حسن نعیم کے صاف وشفاف نثری امتزاج کے وسیلے کی طرح بڑا نفس مضمون پیش کر دیتے ہیں۔اس طرح تشبیہات و استعارات کے باب میں انکی اس طبیعت کا بڑا دخل ہے کہ الفاظ کے مطیع اور معنی ان کی دسترس سے باہر نہیں ہوتے ہیں۔ظاہر ہے کہ یہی انفرادیت انہیں معاصرین میں بلندی عطا کرتی ہے۔

****

باب نمبر۔ ۷

غلام مرتضیٰ راہیؔ کا امیج

غلام مرتضیٰ راہیؔ کا امیج اپنے معاصرین کی آراء کی روشنی میں اظہر من الشّمس ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری کے نکیلے پن سے سبھی کو متاثر کیا ہے۔ ان کی حیرت ناکی اور تحیّر انگیزی کی سبھوں نے کھل کر داد دی ہے۔ راہیؔ ۱۹ برسوں تک علی گڑھ میں مقیم رہے وہاں کے ادباء شعراء سے کافی قریب ہوتے ہوئے بھی ان کی شاعری ان سے متاثر نہیں رہی بلکہ انہوں نے اپنی ایک الگ راہ نکالی۔ شاعری میں زبردست حیرتناکی نے انہیں اپنے معاصرین میں ہمیشہ محترم بنائے رکھا۔ اس ضمن میں سب سے پہلے پروفیسر شمیم حنفی کی رائے نقل کرتا ہوں۔

''ان کی چند غزلیں سننے کے بعد ہی یہ احساس ہونے لگا تھا کہ نئے شاعروں کی بھیڑ میں انہیں آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ ان کی شاعری پر روایت کا سایہ گہرا ہے۔ پرانے مضامین کو اختیار کرنے اور برتنے سے وہ گھبراتے نہیں تھے۔ قافیہ پیمائی اور قدرتِ کلام کا اظہار بھی وہ کرتے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ایک شخصی رنگ ان کے شعروں کو ہجوم میں گم ہونے سے بچائے رکھتا تھا۔ وہ ایسے تجربے بھی نظم کرتے تھے جن کا تعلق نئے طرز احساس اور شاعری کے نئے محاورے سے تھا۔ مجھے ان کے شعروں میں جو بات اچھی لگی، یہ تھی کہ تخلیقی واردات کے کامراں لمحوں میں انکا شعور رچا ہوا، انکی حسیت اپنے عہد سے مشروط، انکا لہجہ منفرد اور انکی زبان تربیت یافتہ دکھائی دیتی تھی۔ ایک خاص قسم کی چابک دستی بیان میں اور شاعرانہ وفور انکے ادراک میں تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ خوبیاں راہی

صاحب کے تمام ہم عصروں کے یہاں نہیں ملتیں۔فکر کی تازگی کو قائم رکھنا اور اسی کے ساتھ اپنی روایت سے رشتوں کو محفوظ بھی رکھنا مشکل ہے۔راہیؔ صاحب کے بہت سے اشعار کا تیور غزل کے عام مزاج سے مختلف ہے۔وہ ناہموار زمینوں اور بیان کے ناموس علاقوں میں قدم رکھنے سے گھبراتے نہیں۔غیر شاعرانہ تجربوں اور اسالیب کو بھی آزمانا چاہتے ہیں۔نئے لفظوں کا استعمال بھی کرتے ہیں تاکہ اپنے شعر کے رسمی حدود میں وسعت پیدا کرسکیں۔'' [1]

پروفیسر شمیم حنفی کا یہ تجزیہ صد فیصد درست ہے کہ راہیؔ کا تعلق نئے طرز احساس اور نئے محاورے سے ہے۔اور یہ اپنی شاعری میں نئے لفظوں کے استعمال سے ایک نیا جہانِ معنی پیدا کرتے ہیں۔راہیؔ شروع سے ہی اس معنوں میں محتاط رہے ہیں کہ ہر شعر نپا تلا اور متوازن رہے۔الفاظ کے برتنے میں شعری تمکنت مجروح نہ ہو جائے۔روایتی خیالات پر جدیدیت کا پیرہن ڈال کر حیرت نا کی پیدا کرنا انکے شروعاتی دور کے شعروں میں بھی حد درجہ موجود رہا ہے۔راہیؔ کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

میں اپنی جان ہتھیلی پہ رکھ کے چلتا ہوں
اب اس سے بڑھ کے کوئی اور مجھ سے کیا لیگا

بجھا کے سویا تھا میں ایک اک چراغ مگر
کھلی جو آنکھ تو جلتا ہوا مکان ملا

تغیرات کا یہ سلسلہ نہ آگے بڑھے
خود اپنی راہ میں دیوار ہو لیا جائے

پڑا جو پاؤں تو سر سے گزر گیا پانی
کہ فرشِ راہ کی مانند سبز کائی تھی

فضائے دشت بڑی دیر سے مکدّر ہے

---

[1] لاکلام کے بارے میں۔۔۔مطبوعہ سفیر اردو، کراچی/لندن۔شمارہ جولائی، ستمبر ۲۰۰۳ء

پسِ غبار کوئی قافلہ نہ آتا ہو

غلام مرتضیٰ راہیؔ کی شاعری میں بے ساختگی اور نکیلے پن کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اس سے متعلق کئی معاصرین نے اپنی پسندیدگی کی مہر ثبت کر دی ہے۔ مثال کے طور پر انور شیخ کی یہ رائے۔

''راہی کا انداز بیاں منفرد ہے جس میں بے ساختگی اور نکیلا پن کے علاوہ عرفان ذات اور خود یابی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ البتہ اس میں میرؔ کا سوز اور غالبؔ کا ساز نہیں، اس کی وجہ تغزل کا بدلتا ہوا رنگ ہے۔'' [۱]

ڈاکٹر شمیم حنفی بھی 'لامکاں' کی غزلوں سے متعلق اسی طرح کی رائے رکھتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ

''راہی صاحب کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ صاف ستھرے اور منظّم طریقے سے ان تجربات کے اظہار کا ہنر بھی رکھتے ہیں۔ زبان و بیان کے رموز سے وہ واقف ہی نہیں ان پر قادر بھی ہیں۔ چنانچہ 'لامکاں' کی غزلوں میں جا بجا ایسے اشعار ملتے ہیں جنکا بے ساختہ لہجہ اور نکیلا پن اچھی غزل کا مزاج رکھنے والوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے'' [۲]

ڈاکٹر بشیر بدرؔ، غلام مرتضیٰ راہیؔ کی شاعری سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں

''سچائی یہ ہے کہ اُن (راہیؔ) کے اپنے احساسات اور تجربات ہیں اور شعری اظہار میں مخصوص الفاظ کے ساتھ جس تخلیقی انداز سے غلام مرتضیٰ راہی تہہ داری اور نکیلا پن پیدا کرتے ہیں وہ قابل قدر ہے''۔ [۳]

---

۱ تبصرہ ۔۔حرف مکرر ازانور شیخ، مطبوعہ سہ ماہی لبرٹی، کارڈف (U.K.) شمارہ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۷ء

۲ تبصرہ برائے لامکاں ۔۔ازڈاکٹر شمیم حنفی

۳ رائے لامکاں کے حوالے سے۔۔ازڈاکٹر بشیر بدرؔ

محولہ بالا آراء کی روشنی میں یہ بات مصدقہ ہو چکی ہے کہ راہیؔ کی شاعری میں ایک غضب کی تہہ داری اور نکیلا پن ہے جو قلب کے اندر تک وار کرتی ہے۔ ذہن و دماغ کو جھنجھوڑ ڈالتی ہے۔ ساکت رگوں میں خون کی لہروں کو موجزن کرتی ہے۔

شاہد جمیلؔ نے بھی غلام مرتضیٰ راہیؔ کی شاعری کے حوالے سے اسی طرح کی رائے پیش کی ہے

''موضوعات کے برتاؤ میں راہیؔ کی غزلوں میں بیانیہ اکثر ایک متحرک Statement کے انداز میں ملتا ہے جو قدرے نوک دار ہے جس کے بطن میں ایک بانکپن، ایک Smartness موجود ہوتا ہے جو غزل کے قاری کو پہلے چکا چوند کرنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر رک رک کر ہر ہر شعر پر ٹھہر ٹھہر کر سوچنے اور بصیرت کی تہوں تک اترنے کے لئے راہیں ہموار کرتا ہے'' [1]

راہیؔ کے بیشتر شعروں میں بیانیہ انداز ایک حیرت ناکی لئے ملتا ہے شاید اسے ہی شاہد جمیل نے متحرک Statement کہا ہے۔ ان کے کلام کی سادگی بھی یہی ہے کہ وہ متحرک ہوتا ہے۔ ان کا انداز پیشکش ساکت و جامد نہیں ہوتا۔ ان کے تخیلاتی پیکر میں ایسے جذبات کی چنگاری چھپی ملتی ہے جو رہ رہ کر اپنے وجود کا احساس دلاتی رہتی ہے۔ راہیؔ کے چند اشعار بطور حوالہ پیش کئے جاتے ہیں۔

ماضی ! تجھ سے حال مرا شرمندہ ہے
مجھ سے اچھا آج مرا کارندہ ہے

تم کو ہے سایۂ دیوار کی عجلت لوگو!
اتنی جلدی مرا سورج کبھی ڈھلنے کا نہیں

---

[1] تبصرہ۔۔از شاہد جمیل، مطبوعہ جدید اسلوب۔۔سہسرام شمارہ نمبر ۴۔۳

الگ سب سے تری پہچان بنتی جا رہی ہے
ہمارے درمیاں رہ کر اکیلا کیا کرے گا
یہ تیرے رنگ و نور کے ماخذ کا ہے سوال
اے میرے ماہتاب! مجھے آفتاب لکھ

راہی کے اشعار کو سرسری پڑھ کر ان کے مفہوم کی گہرائی تک نہیں پہنچا جا سکتا بلکہ رک رک کر، ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے سے اس کے رموز و اسرار کی گرہیں کھلنے لگتی ہیں اور ذہن و دل پر ایسا تاثر قائم ہوتا ہے کہ بہت بعد تک اس کی پُر اسراریت سے لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر سراج اجملی اپنے مضمون ''غلام مرتضیٰ راہی کی شاعری پر نوٹ'' میں اس امر کی تائید کرتے نظر آتے ہیں۔ان کے مطابق

''غلام مرتضیٰ راہی کے جس مجموعے کی ورق گردانی کیجئے آپ کو اس میں جگہ جگہ پر رُک کر سوچنے اور دوبارہ پڑھنے کے لئے مجبور ہونا پڑے گا۔کہیں بیان کی ندرت، کہیں اظہار کی شائستگی، کہیں جدّتِ ادا، کہیں تخلیقیت کی سرشاری اور کہیں شعر سازی کی فن کارانہ چابک دستی غرض متعدد وجوہ سے آپ راہی کے کلام سے اپنے آپ کو الگ نہ کر پائیں گے۔''[1]

اس قبیل کے چند اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

سب گھیر کر کھڑے ہوئے مجھ کو پھر اس کے بعد
حیران رہ گئے کہ تماشہ نہیں ہوں میں
کشتیاں فکر مند رہتی ہیں
ایک سے دوسرے کنارے کی

---

[1] غلام مرتضیٰ راہی کی شاعری پر ایک نوٹ۔از ڈاکٹر سراج اجملی، مطبوعہ اسباق، پونہ جنوری تا دسمبر ۲۰۰۶ء

سب فاصلہ ایک جست میں لہروں نے کیا طے
تم کہتے تھے گھر میرا سمندر سے پرے ہے
وہ ایک ضرب لگا کر نکل گیا اُس پار
تڑپ کے رہ گیا دریائے نیل اپنی جگہ
ندی میں ڈوب گئے بے شمار پروانے
لویں چراغوں کی پانی کو خشک کرتی رہیں
اتر کے رہ گیا ہو جیسے کوئی خنجر سا
کھڑا ہے دشت کے پہلو میں اک شجر ایسا

جدیدیت کے نام پر جو مہمل گوئی، فحاشی اور شعبدہ بازی ہو رہی تھی غلام مرتضیٰ راہی نے اس سے خود کو بچائے رکھا۔ شاعری کے نام پر پھکڑ پن کا بازار گرم تھا ایسی بے حجابی ادب میں سرایت کر گئی تھی کہ شعریت بہت دنوں تک ان کی حرکتوں سے شرم سار رہی۔ جیسے

بکری میں میں کرتی ہے
بکرا زور لگاتا ہے
(ساحل احمد)

ذرا ٹھہر ابّا ادھر آگئے
ار ی سالی جلدی سے جمپر گرا
(باقر مہدی)

کیوں جسم کی عریانی کپڑوں میں چھپاتے ہو
اندام کی رنگت تو کھلنے پہ نکھرتی ہے
(احتشام اختر)

چڑھ گیا نشہ تو کرے گی 'ہاں'
بازوؤں میں اسے جکڑ کے دبوچ
(ناصر شہزاد)

ان شعراء کے علاوہ بھی دیگر شعراء کے یہاں اسی طرح کے اشعار کہے جارہے تھے جس سے پورا معاشرہ پراگندہ ہورہا تھا۔شعریت مجروح ہورہی تھی اس فیشن زدگی سے راہیؔ نے اجتناب کیا۔اور اپنی شاعری کو فرسودگی سے ہمیشہ پاک رکھا۔

بقول ڈاکٹر جمیلہ عرشی

''غلام مرتضیٰ راہیؔ کے کلام کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ غزل کے فرسودہ مضامین سے قطع نظر ایسے حیرت انگیز موضوعاتِ سخن ہمارے سامنے لاتے ہیں کہ ہمیں ان کی اچھوتی فکر اور اسلوب کی تازہ کاری کی داد دینی پڑتی ہے۔وہ اپنی کاوشِ فکر میں تخلیقی تجسس سے وہ کچھ بھی کہہ جاتے ہیں جو آج تک کسی نے نہیں کہا۔ان کے ذہنی رجحان اور فکری میلان سے عجیب وغریب Theme پیدا ہوتی ہیں جو قاری کو چونکا دیتی ہیں''[1]

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط نے اپنے ایک مضمون میں غلام مرتضیٰ راہیؔ کے ان ہی اوصاف کی طرف اشارہ کیا ہے۔فرماتے ہیں

''راہیؔ کے تغزل میں غزل کے عنوان سے 'جنسیات' کے حامل کریہہ اور متعفن خیالات شاید ہی کہیں پائے جاتے ہوں۔ ہاں صالح افکار اور افادیت کا شعور ان کے تغزل میں روح کو گرماتے ہیں۔صالح اقدارِ حیات سے مملوان کے اشعار میں شعور و وجدان کی کارفرمائی با آسانی پہچانی جاسکتی ہے۔انکا وجدان 'روح افزا' ہے اور شعورِ حیات پرور۔مکر وفریب اور لہولعب جیسے گھٹیا اور رکیک جذبات کو مشتعل کرنے

---

[1] لاکلام ایک اجمالی جائزہ۔۔از ڈاکٹر جمیلہ عرشی،مطبوعہ اردو بک ریویو،دہلی۔مارچ راپریل ۲۰۰۱ء

والے اشعار ان کے یہاں نہیں پائے جاتے۔ اس اعتبار سے اگر ان کی شاعری کا تجزیہ کیا جائے تو ان کے یہاں 'خیر' کے عناصر ہی زیادہ دکھائی دینگے۔ 'شر' کے عناصر سے ان کی شاعری اکثر پاک دکھائی دیتی ہے۔'' ؎۱

غلام مرتضیٰ راہی نے اپنی شاعری میں تشبیہات و استعارات، رمزیت و علامات کے استعمال سے شعر کی غنائیت کو رفعت بخشی ہے۔ شعری کائنات کی تخلیق میں ان امور کی بالا دستی ضروری ہوتی ہے۔ راہیؔ کے یہاں بھی اس سے اجتناب کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ بلکہ انہوں نے ان کے استعمال سے شعری فلک کو زیادہ واضح اور روشن کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کے یہاں جو تشبہات و استعارے گڑھے گئے ہیں اس کا کینوس بہت وسیع و بلیغ ہے۔ میرے اس خیالات کی تائید ڈاکٹر رفیق احمد نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

''غلام مرتضیٰ راہیؔ اپنی شاعری میں شعور اور ادراک اور دلیل و منطق کے بجائے تشبیہات و استعارات، رمزیت، صنائع بدائع اور لفظیات کی نادرہ کاری جیسی فنّی خصوصیات کو اپنے تصرف میں لاتے ہیں انکے فن میں قول محال، پیکر تراشی، الفاظ یا فقروں کی تکرار اور زبان کی حیرت انگیز روانی نمایاں ہے۔'' ؎۲

راہیؔ نے ان علامتوں اور استعاروں کو برتنے میں اس بات کا خاصہ دھیان رکھا ہے کہ اپنے آس پاس کے بکھرے ہوئے موتیوں سے ہی جہان معنی پیدا کیا جائے۔ نہ کہ ابہام و ایہام کے صحرا میں بھٹک کر شعری معنویت کو مجروح کیا جائے۔ ان کے شعری استعارات ان کے اور ان کے قاری کے درمیانی پل کا کام کرتے ہیں۔ جس سے راہیؔ شناسی میں آسانی ہو جاتی ہے۔ ان کے مزاج کی بلندی شعروں کی شکل میں

؎۱ غلام مرتضیٰ راہیؔ کے کلام کا عروضی تجزیہ۔ از ڈاکٹر یحییٰ نشیط۔ مطبوعہ سہ ماہی 'رنگ' دھنباد۔ اپریل رمئی رجون ۲۰۰۴ء

؎۲ تبصرہ لا کلام۔۔ از ڈاکٹر رفیق احمد، مطبوعہ سہ ماہی نخلستان، جے پور، جنوری تا مارچ ۲۰۰۲ء

سامنے آتی ہے۔ راہیؔ اپنے شعری آئینے میں ایک صاف اور باشعور شاعر نظر آتے ہیں۔ ان کی فکری جہت سے شعر کی رعنائیوں میں کبھی ختم نہ ہونے والا حُسن پیدا ہو جاتا ہے۔ کرشن کمار طور کی رائے کے مطابق،

''غلام مرتضٰی راہیؔ نے اپنے آئینہ احساس سے محرکات کی جو رمز سازی کی ہے وہ نہ صرف فعال ہے بلکہ ان کی شعری ارتکاز کی ایک نادر مثال بھی ہے۔ انہوں نے بلند آہنگ غزلی تفکر کے بجائے سامنے کی علامتوں اور استعاروں سے اپنے اشعار کی تخلیق کی ہے اور اسے براہ راست اپنے پڑھنے والوں کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ ایسا کرنے میں انکے اور ان کے قاری کے درمیان ایک خاص قسم کا ذہنی اور قلبی رشتہ استوار ہو جاتا ہے۔ ان کی شعری ملکیت، ان کی اندرونی قلبی واردات میں قاری ان کی مشترک وراثت کا حصہ دار بن جاتا ہے اور ایسا وہی شاعر کرسکتا ہے جو انسانی رفعت اور جذباتی قدروں کو احترام کی نظر سے دیکھتا ہو''۔[1]

کرشن کمار طور دنیائے شعر و ادب کا ایک جانا مانا نام ہے۔ وہ پارکھی نظر رکھتے ہیں۔ شعر فہمی اور شعری در و بست پر انہیں گہری دسترس ہے۔ راہیؔ کی شاعری کے تعلق سے ان کی یہ رائے راہیؔ کے شعری سرمائے کے عمیق مطالعہ کے بعد ہی صفحۂ قرطاس پر رقم ہوئی ہے۔ راہیؔ کی شعری ملکیت میں قاری کی مشترک وراثت کا حصہ دار ٹھہرانا راہیؔ کی انسانی رفعت کو اجاگر کرتا ہے۔ راہیؔ کے اشعار اس امر کی تصدیق کرتے ہیں۔

لے گئی پار بٹھا کر مجھے اک ٹکڑے پر
میں نے ٹوٹی ہوئی کشتی پہ بھروسہ رکھا

دستک سی کوئی ہوتی ہوئی دور دور تک
کھلتا ہوا کہیں نہ کہیں کوئی باب سا

---

[1] تبصرہ برائے لاکلام۔ کرشن کمار طور، مطبوعہ سہ ماہی 'مژگاں' کلکتہ جنوری تا جون ۲۰۰۳ء

شام تک زرد پڑ گیا سورج
ذرہ ذرہ کرن کا پیاسا تھا

ڈاکٹر علیم اللہ حالی کے مطابق

''غلام مرتضٰی راہی، غزل کہنے کا آرٹ جانتے ہیں۔غزل کی لغات اور اشارات سے واقف ہیں۔وہ سمجھتے ہیں کہ غزل، عدم صراحت کا فن ہے۔یہاں گفتہ اور نا گفتہ دونوں کی ضرورت ہے۔راہی کو معلوم ہے کہ اکثر نا گفتنی، گفتنی سے زیادہ حسین ہوتی ہے اور بلیغ بھی''۔ ۱

غلام مرتضٰی راہی کی شاعرانہ فنکاری کی ہر کسی نے تعریف کی ہے۔واقعی غزل کہنے کے فن سے راہی بخوبی واقف ہیں۔انہوں نے غزل کی آبرو کا تحفظ کیا ہے۔اس کے رموز و اسرار کو بحال رکھا ہے تبھی تو علیم اللہ حالی جیسے معتبر شاعر و ناقد درج بالا اقتباس کہنے پر مجبور ہو گئے۔انہوں نے راہی کی شاعری کا عمیق مطالعہ کے بعد یہ بھی نتیجہ برآمد کیا ہے کہ

''اب تک شاعروں کی جو دونئی کھیپ سامنے آئی ہے اس نے غلام مرتضٰی راہی کے کلام کے مطالعہ سے لفظوں کو برتنے کا اہتمام سیکھا ہے۔نئے مضامین کو جزو سخن بنانے کا ہنر جان لیا ہے۔روایت کے حسن کو سمجھ کر اس سے انحراف کرتے ہوئے اظہار کے نئے گوشے پیدا کرنے کا علم حاصل کیا ہے'' ۲

علیم اللہ حالی کے نظریئے کے مطابق راہی نئی نسل کی آبیاری میں معاون ثابت ہو رہے ہیں۔ان کی غزلیات سے نئے باب وا ہو رہے ہیں۔ان کے کلام میں لفظوں کے برتنے کا جو سلیقہ ہے وہ انکی شاعری کو دوام بخشنے کے لئے کافی ہے۔لفظوں

---

۱ تبصرہ برائے لاکلام۔از ڈاکٹر علیم اللہ حالی، مطبوعہ ماہنامہ 'شاعر' بمبئی۔شمارہ جون ۲۰۰۱ء
۲ لاشعور کے فلیپ پر رائے۔ڈاکٹر علیم اللہ حالی

کو نئے انداز فکر دے کر شعروں میں پیش کرنے کا ہنر راہیؔ کو بخوبی آتا ہے۔ اس کے لئے وہ بھاری بھرکم الفاظ کا استعمال نہیں کرتے بلکہ سامنے کی چیز کو اس ڈھنگ سے پیش کر دیتے ہیں کہ تحیّر انگیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ آج کے بیشتر شعراء اپنی شاعری میں قاری کو ششدر کرنے کی کوشش میں ابہام کا شکار ہو جاتا ہے۔ لیکن راہی نے شروع سے تخلیقی وساطت میں ایک توازن قائم رکھا ہے۔

انہوں نے روایت سے انحراف بھی کیا ہے لیکن اس کے احترام سے انہیں انکار بھی نہیں ہے انہوں نے روایتی پسِ منظر کو جدّت کی جگمگاتی روشنی میں بقعۂ نور بنا دیا ہے۔ ان میں نئی جان پھونک ڈالی ہے۔ مثال کے طور پر کسی نامعلوم شاعر کا ایک مشہور شعر

فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

جس کا پسِ منظر بالکل روایتی ہے اسے راہیؔ نے جدید رنگ بھر کر نیا جہانِ معنی پیدا کر دیا۔ شعر یوں ہے۔

اُس کا بھی محافظ تو آخر کوئی ہوگا ہی
فانوس سے باہر جو اک شمع فروزاں ہے

کسی شاعر کا ایک اور شعر۔

جب تک بکے نہیں تھے کوئی پوچھتا نہ تھا
تو نے مجھے خرید کے انمول کر دیا

راہیؔ نے اسی خیال کو ایک نیا رنگ و روپ دے کر ہمارے سامنے اسطرح پیش کیا ہے۔

مثال سنگ ہوں میں اسکی بے رخی کے سبب
سراپا آئینہ، اس کی توجہات سے تھا

راہیؔ کی خیال بندی انہیں دوسرے ہم عصر شعراء میں ممتاز کرتی ہے۔انکی سوچ میں ایک فلسفہ پوشیدہ رہتا ہے۔جو عام قاری کی فکر سے بالاتر ہوتا ہے۔شعروں میں تازگی اور دلکشی پیدا کرنے کے لئے فکری جہت ضروری ہے جو راہیؔ کے یہاں قدم بہ قدم موجود ہے۔

بشرنوازؔ، غلام مرتضٰی راہیؔ کی شاعری سے کافی متاثر رہے ہیں۔راہیؔ کی شاعری سے متعلق ان کی رائے راہی شناسی کے لئے راہ ہموار کرتی ہے۔بشرنواز لکھتے ہیں۔

''غلام مرتضٰی راہیؔ کی غزل مجھے ہمیشہ عزیز رہی ہے کیونکہ اس میں قدیم وجدید کا خوبصورت اور متوازن امتزاج ہے اور میرے خیال میں اس توازن کو حاصل کرنے کے لئے بڑی ریاضت اور صاحب نظری کی ضرورت ہوتی ہے۔'لاکلام' میں شاعر کی شخصیت بھی اپنی نمود کرتی ہے اور اس کا عہد بھی بولتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور یہ کیفیت تب پیدا ہوتی ہے جب شاعر/ قلمکار اپنے عہد سے نبرد آزما بھی ہو اور اس سے بے پناہ وابستگی بھی رکھتا ہو۔نبرد آزمائی بھی وابستگی کی ہی بدلی ہوئی شکل ہوتی ہے۔ بشرطیکہ یہ بطور فیشن اختیار نہ کی گئی ہو۔اور یہ بات تو راہیؔ کے دشمن بھی تسلیم کریں گے کہ راہی کے ہاں تبدیلی فیشن کی نہیں بلکہ بدلتے ہوئے انداز فکر وطرزِ احساس کی پیدا کردہ ہے۔اس مجموعہ میں شامل اکثر اشعار اور مصرعے اپنی بے ساختگی، سادگی اور سچائی کے سبب حافظے کا حصہ بن جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور مشرقی تنقید اسی خصوصیت کو اچھے شعر کی اولین پہچان قرار دیتی ہے۔میں مغربی نظریاتِ تنقید کا احترام کرنے کے باوجود ایسے اشعار غزل کو سچا شعر مانتا ہوں جو اپنے قاری یا سامع کی زندگی میں شامل ہوسکتا ہے۔راہیؔ کے پاس ایسے اشعار کی کمی نہیں اور یہ بڑی بات ہے۔''[1]

بشرنوازؔ کے مطابق راہیؔ کی شاعری میں قدیم اور جدید دونوں کا ایک متوازن رشتہ ہے اور یہ حق ہے کہ اس طرح کے توازن برقرار رکھنے کے لئے بڑی ریاضت کی

---

1. لاکلام پر تبصرہ۔۔بشرنواز

ضرورت ہوتی ہے۔ راہیؔ کی شاعری میں اس کا عہد بولتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یعنی راہیؔ اپنے عہد سے الگ تھلگ ہوکر کچھ نہیں کہتے۔ عہد کا المیہ ان سے شعر کہلوا لیتا ہے۔ ان کے شعری مجموعے جس عہد کی پیداوار ہیں وہ اس کا پورا احاطہ کرتے ہیں۔ اس زمانے کے واقعات وسانحات، سماجیات، اخلاقیات، معاشیات، سب پر ان کی گہری نظر ہے جسے انہوں نے اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ ان کے یہاں یہ سب بدلتے ہوئے انداز فکرو طرزِ احساس کی پیدا کردہ ہیں۔ ان کے درج ذیل اشعار اپنے عہد کی غمازی کرتے ہیں۔

توپ، بندوق، سناں، تیروکماں، تیغ و سپر
سب ملے خاتمۂ جنگ پہ لشکر نہ ملا
میری آنکھوں نے جام دیکھے ہیں
آنسوؤں کی طرح چھلکتے ہوئے
اے زمیں ایسی کشش تجھ میں کہاں سے آئی
دو گھڑی اوج پہ رہنا مرا دشوار ہوا
میری پہچان بتانے کا سوال آیا جب
آئینوں نے بھی حقیقت سے مکرنا چاہا
آگے آگے چلتا ہے کوئی راہ دکھلاتا
آبلوں سے تلوؤں کے روشنی نکلتی ہے

(لاکلام)

فضائے دشت بڑی دیر سے مکدّر ہے
پسِ غبار کوئی قافلہ نہ آتا ہو
میں تو سورج کو بڑے پیار سے تکتا ہوں مگر
وہ مری آنکھوں میں چبھ جاتا ہے نشتر کی طرح

سراب ہے کہ حقیقت پتہ نہیں چلتا
پہنچ سکی ہے جہاں تک مری نظر اب تک
لگے تھے راکھ کے انبار میرے چاروں طرف
عجیب آگ تھی مجھ میں کہ میں دبا نہ سکا
ہر اک ذرے سے آتی ہے العطش کی صدا
سمندروں پہ کسی روز میں برس نہ پڑوں
عکس تغیرات ، سر آئینہ نہ پوچھ
تھی مجھ میں تابِ دید جو میں دیکھتا رہا

(لامکاں)

چوٹیوں کی طرح اُٹھے بادل
پتھروں کی طرح گرا پانی
سائبان کے نیچے بیٹھا ہوں پھر بھی
برس رہی ہے جیسے میرے سر پر آگ
درخت، راستے، انساں، عمارتیں، سورج
اٹھا غبار تو اک اک نشان ختم ہوا
میرا بھی زلزلے سے لرزتا رہا مکاں
یہ اور بات ہے تہہ و بالا نہیں ہوا
اب مجھے جس طرح چاہو دیکھ لو
اب نہیں باقی میری پہچان تک
ہر طرف درند تھے تاک میں شکار کی
آدمی کے خون کا ذائقہ عجیب تھا

کچھ ٹھیک نہیں ہے کہ ہم اس اندھے سفر میں
سر کو کہاں رکھ دیں ، کہاں تلوار اٹھالیں
(لاریب)

ہمسری اُن سے جو کرنا چاہے
اس کو سولی پہ چڑھا دیتے ہیں
بعض خوشیاں نہیں جینے دیتیں
بعض غم عمر بڑھا دیتے ہیں
نکالا کانٹے سے کانٹا کبھی کبھی ہم نے
چبھے تو دونوں مگر ایک مہرباں ٹھہرا
رات کا کوئی تعین ہے نہ دن کا ہے شمار
وقت کی رفتار ہے کچھ اور ہی میرے یہاں
آدمی چاہتا ہے اب جو خلا میں رہنا
دیکھیں بنیاد عمارت کی کہاں رکھتا ہے
نہ میرے پاس دولت ہے نہ طاقت ہے نہ رتبہ
کوئی اس حال میں مجھ پر بھروسہ کیا کریگا
کیسا انساں ترس رہا ہے جینے کو
کیسے خشکی پر اک مچھلی زندہ ہے
کوئی جذبہ نہیں صادق رہا اب
کہاں وہ دوستی ، وہ دشمنی ہے
(لاشعور)

غلام مرتضیٰ راہیؔ کو یہ فخر حاصل ہے کہ ان کی شاعرانہ ذہنیت کو دورِ حاضر کے

بڑے مفکر و ناقدین شعراء و ادبا اور معاصرین نے تندہی سے پڑھا اور پرکھا ہے اور اپنی گرانقدر آراء سے نواز کر انکی شاعری کو امتیازی شان عطا کی ہے۔ان ناقدین کی آراء سے مجھے راہیؔ کے شاعرانہ امیج کا تعین کرنا آسان ہو جائے گا۔عہد حاضر کے ایک بڑے مفکر، ناقد اور دانشور ڈاکٹر وہاب اشرفی نے اپنے کتاب 'تاریخ ادب اردو' میں غلام مرتضٰی راہیؔ کی شخصیت و شاعرانہ ذہنیت سے متعلق رقم کیا ہے۔

''میں نے انکے لامکاں کے سلسلے میں ایک سرسری بات کہی تھی کہ اسے اس نقطہ نظر سے پڑھنا چاہیئے کہ اس سے ایک عظیم عمارت کی بنیاد پڑ گئی ہے اور یہ سچ ہے کہ 'لا شعور' تک آتے آتے انہوں نے اپنی شاعری کو اس طرح صیقل کیا ہے کہ بلا مبالغہ ان کی شاعری عصری شاعروں میں انفرادیت کی حامل ہو گئی ہے۔موصوف بڑے سلیقے سے مختصر بحروں میں نئی معنویت پیدا کرتے ہیں۔الفاظ سامنے کے ہوتے ہیں لیکن ان میں گہری معنویت کے ابعاد اُبھرتے ہیں۔زبان و بیان پر قدرت انہیں وہ راہ دکھاتی ہے جو سہل ممتنع کی راہ ہے۔لیکن اس راہ میں انکی وضع گہری معنویت کا حصول ہے لہٰذا اس معاملے میں وہ خاصے کامیاب ہیں۔کلاسیکی شاعری کے مطالعے نے ان کے ذہنی آفاق کو وسیع کر رکھا ہے۔یہ اور بات ہے کہ وہ کسی فلسفے کی بنیاد نہیں رکھتے نہ تو کوئی متعینہ فکر کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔یہ امور ضروری بھی نہیں ہیں۔لہذا یہ بات بڑے اطمینان سے کہی جا سکتی ہے کہ غلام مرتضٰی راہیؔ اردو شاعری میں نئی سج دھج کے شاعر ہیں''۔[1]

محولہ بالا اقتباس کی روشنی میں غلام مرتضٰی راہیؔ کی تشخیص کرنے میں آسانی فراہم ہونے کے پیش نظر میں واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ان کے یہاں نئی امیجری کی دریافت کا بڑا اصاف ستھرا سلیقہ ملتا ہے۔میری سمجھ سے جس شاعر کے یہاں امیجری کے باب میں نقوش چھوڑے جانے کے جوہر ملتے ہیں ان میں غلام مرتضٰی راہیؔ کی

[1] تاریخ ادب اردو (ابتداء سے ۲۰۰۰ءتک) از وہاب اشرفی، جلد سوم، صفحہ نمبر ۲۹-۱۷۲۸

شخصیت منفرد نظر آتی ہے۔

اب ہم مختلف ناقدین کے ان ارشادات کے کلیدی نکتوں کی طرف آتے ہیں جن کے تناظرات میں غلام مرتضیٰ راہی کے شاعرانہ امیج کو سامنے لا سکتے ہیں۔

۱۔ بقول آل احمد سرور راہی کے کلام میں نئی حسیت ہے جس سے ان کی معنویت مسلّم ہے۔

۲۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے غلام مرتضیٰ راہی کے شاعری میں انفرادیت اور شعری کردار کو مستحکم کرنے والا شاعر کہا ہے۔

۳۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی لامکاں کے بیشتر اشعار سے انکے ذاتی اسلوب کی تلاش ممکن ہے۔

۴۔ لامکاں کے حوالے سے محمد حسن نے لکھا ہے کہ غزل کے نئے امکانات روشن ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

۵۔ وارث علوی نے انہیں اس دور کا اہم شاعر قرار دیا ہے۔

۶۔ راہی کی غزل سے عشق کرنے والے بانی نے انہیں غیر معمولی شاعر قرار دیا ہے۔

۷۔ شہریار نے غزل کی نزاکتوں اور بلاغتوں کے حوالے سے راہی کو منفرد شاعر کہا ہے۔

۸۔ پروفیسر شمیم حنفی نے منفرد لہجہ، عہد سے مشروط حسیت کی نشاندہی کی ہے۔

۹۔ کرامت علی کرامت نے ہمیشہ زندہ رہنے والا شاعر کہا ہے۔

۱۰۔ مظہر امام نے راہی کے کلام کو بیش قیمت سرمایہ کہا ہے۔

۱۱۔ علیم اللہ حالی نے نئے مضامین کو جزوِ سخن بنانے کا ہنر جاننے والے شاعر کی حیثیت سے راہی کی شناخت کی ہے۔

۱۲۔ بقول عرفان صدیقی، راہی کی شاعری تخلیقی سچائی اور حسن کی شاہد ہے۔

۱۳۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری کو راہی کے یہاں تخلیقی ذہن کی غیر معمولی فعالیت دکھائی دیتی ہے۔

۱۴۔ عشرت ظفر کے مطابق یہ غالب کی خیال بندی کا ہی کمال ہے جس نے راہی جیسے شاعر کو جنم دیا ہے۔

۱۵۔ بقول سلطان اختر ہندوستان کے غزل گویوں میں بہت کم لوگ ہیں جس میں وہ راہیؔ کا نام لیتے ہیں۔

۱۶۔ بقول عتیق اللہ راہی نے غزل کو نئے تیور دیئے ہیں۔

۱۷۔ بقول مصور سبزواری بلاشبہ راہی عصریت کے نئے پن اور غیر روایتی روایت کے حسن کے امین ہیں۔

۱۸۔ بقول لطف الرحمٰن اردو غزل میں ان کی آواز امتیازی شان اور انفرادیت سے عبارت ہے۔

۱۹۔ ڈاکٹر وحید اختر کے مطابق ہندوستان میں غزل کے جدید لہجے اور محاورے کو تخلیقی بصیرت کے ساتھ موضوعی تجربے کی اساس پر مستحکم کرنے والے شعراء میں غلام مرتضیٰ راہیؔ کا نام بھی شامل کیا جانا چاہیے۔

محولہ سطور میں ان اہم ناقدین کی آراء کی تلخیص درج کی گئی ہے جس سے غلام مرتضیٰ راہیؔ کی شاعری کے حوالے سے جو امیج بنتا ہے وہ ہمارے تصور سے میل بھی کھاتا ہے اور توقعات پر کھرا اترتا ہے۔

حتمی طور پر میں کہنا چاہتا ہوں کہ نئی غزلیہ شاعری میں غلام مرتضیٰ راہیؔ کا امیج بے حد روشن ہے۔ غزل میں نئی حسیت، انفرادیت، ذاتی اسلوب، غزل میں نئے امکانات، ہم عصروں میں امتیازی حیثیت، غیر معمولی شاعرانہ شخصیت، مشروط حسیت، ہمیشہ زندہ رہنے والا شاعر، سرمائے کے اعتبار سے بیش قیمت، مضامین کو جزو سخن بنانے کے ہنر سے آشنا، تخلیقی سچائی، تخلیقی ذہن کی غیر معمولی فعالیت، غالب کی خیال بندی کے کمال ہنر کو فروغ دینے والے کی حیثیت سے غلام مرتضیٰ راہیؔ کا امیج نہ صرف غزلیہ شاعری کی مستحکم روایت کو فروغ دینے والوں میں بلکہ جدید شاعری میں بھی منفرد اور Unique حیثیت کا حامل ہے۔

****

باب نمبر ۸۔

عظیم غزل گویوں بالخصوص جدید غزل گویوں میں غلام مرتضٰی راہیؔ کا مقام

جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے کہ عظیم غزل گویوں سے مراد وہ شعراء جن کی ادبی عظمت مسلّم ہے۔ان شعراء میں میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، فیضؔ، فراقؔ، جوشؔ، جگرؔ، مجروحؔ، حسن نعیمؔ کے اسمائے گرامی یک لخت ذہن میں گونجنے لگتے ہیں۔ان شعراء کی تخلیقی وراثت ان روایتی شعراء کے کُل سے جاملتی ہے جس سے مستحکم روایت کے اجزاء جڑے ہوئے ہیں۔ان اجزاء میں صحت مند رجحانات کو بروئے کار لانے میں بعد کے جن شعراء نے اپنی پہچان بنائی ان میں بانیؔ، زیب غوریؔ، کمار پاشیؔ، سیّد امین اشرف، عادل منصوریؔ، ظفر اقبالؔ، شکیب جلالی، مظفر حنفیؔ، مظہر امام، غلام مصطفٰی راہیؔ، پرکاش فکری، راج نرائن رازؔ، سلطان اخترؔ، لطیف الرحمٰن کے نام حال کے دنوں میں ابھر کر سامنے آئے ہیں۔اس ضمن میں عشرت ظفر کی یہ رائے میرے خیالات کی تائید کرتی ہے۔

''شروع میں نئی غزل میں بھی کچھ ایسی تصویریں نمودار ہوئی تھیں جو اسے پوری طرح سمجھ نہیں سکی تھیں لیکن جو اسکے بنیاد گذار تھے وہ اس مسئلے کو پوری طرح سمجھتے تھے۔ان میں غلام مرتضٰی راہیؔ کا نام بھی ہے۔دلچسپ پہلو یہ ہے کہ نئی غزل کے آغاز میں جو نام سامنے آئے تھے ان کے لہجے ایک دوسرے سے نہیں ملتے تھے اور ایک انفرادی شان ہر جگہ موجود تھی۔بانیؔ، زیب غوریؔ، مصور سبزواریؔ، نشتر خانقاہیؔ، غلام مرتضٰی راہیؔ سب اپنے اپنے لہجے میں ممتاز و منفرد تھے اور ان منفرد لہجوں نے ہی نئی غزل کو استحکام عطا کیا۔یہاں

یہ بات کہنا ضروری ہے کہ ابتدائی لمحوں میں نمودار ہونے والے نئی غزل کے شعراء نے ہی جو خشت اول رکھی تھی اس پر ساری عمارت تعمیر ہوئی اور ثریا کی رفعتوں تک یہ دیوار سیدھی صاف ایک خطِ مستقیم کی طرح اپنی عمودی شان وشوکت کے ساتھ مینار بابل کی طرح بلند ہوتی چلی گئی ۔اور وہ تمام لہجے اس ساحل بیکراں پر خذف ریزوں کی طرح پڑے رہ گئے جنہیں لہریں بہا کر تو لاتی ہیں لیکن از کار رفتہ اشیاء میں شمار کر کے انہیں ہاتھ نہیں لگاتی ہیں ۔اس سمندر کے ساحلوں کا سفر شروع کریں تو ان گوہروں کے رنگوں کا تموج نظر آئے گا ۔جو اتھاہ میں پڑے ہیں لیکن ساحلوں پر انکی قوس قزحی روشنی پھیلی ہوئی ہے ۔جس میں بعد کے نسلوں نے خود کو سجایا سنوارا۔اس طرح بیسویں صدی کا نصف اوّل ختم ہوتے ہی نئی غزل نے جو شہسوار پیدا کئے ان میں غلام مرتضیٰ راہؔی کا نام اہمیت کا حامل ہے۔''[1]

میری دانست میں عظیم غزل گو سے مراد ایسے شعراء جن کی اردو ادب میں حیثیت بنیاد کی اس اینٹ سے ہے جو یکے بعد دیگرے ان پر رکھے جانے سے اردو غزل کی عمارت بلند ہوئی ۔ میں نے پہلے بھی اپنے مضمون باب نمبر۴ میں ''راہؔی کی شاعرانہ ذہنیت'' میں اس بات کی محققانہ اطلاع پیش کی ہے ۔ راہؔی کا دوسرے عظیم شعراء کی طرح غالب سے بھی رشتہ ہموار ہے ۔اور یہ رشتہ معاملاتِ فکر وفہم سے کم شعری ہنر سے زیادہ جڑا ہوا ہے ۔غالبؔ کے یہاں شعریت کی جو شکل ہے وہ مختلف فکری وفنی ابعاد سے مزین ہے ۔اس کے لئے ذہن کی نکتہ رسی ضروری ہوتی ہے ۔ غالبؔ میں حیوان ظریف کی تمام خوبیاں یکجا دکھائی دیتی ہیں ۔ظرافت کوئی ایسی شئے نہیں ہے جس میں یک رُخِ پن کے ساتھ دنیا کو یا اپنی ذات کو راست طور پر محض طنز کا نشانہ بنا کر تماشہ کھڑا کیا جائے ۔ غالبؔ نباض وقت کے ساتھ ساتھ درونِ ذات انتشار زدہ شخص کو چھپائے رکھتے ہیں، یہ ہمہ گیریت یوں ہی حصے میں نہیں آتی ۔

---

[1] حرف باریاب ۔عشرت ظفر

غلام مرتضیٰ راہی سے انکا معاملہ حیات و کائنات کی پُر اسراریت اور اس پر پڑے دبیز پردے کو ہٹانے کے تجسّس کے ساتھ ملتا ہے۔ یہی کرید انہیں غالب کے قریب کرتی ہے۔ اس سے قبل میر کا حزنیہ رنگ اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ مستقبل میں ہونے والی شاعری کا غالب طریقۂ اظہار بن چکا ہے۔ اس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو۔ میر غالب کی عظمت زمانہ وار تقسیم کے دائرے میں رکھ کر جس طرح سمجھی جاسکتی ہے اسی طرح راہی کا ان دو شعراء سے ذہنی مواصلت کی بنیاد انتشارِ ذات اور عرفانِ ذات دو کلیدی صورت حال سامنے رکھ کر ہی قائم کی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر۔

چشم خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا
ہم تو سمجھتے تھے کہ اے میر یہ آزار گیا

(میر)

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

(غالب)

بہت خون اس میں بہا خواہشوں کا
وہ اک جنگ دل سے جو میں نے لڑی ہے

(غلام مرتضیٰ راہی)

مثال سنگ ہوں میں اس کی بے رخی کے سبب
سراپا آئینہ اس کی تو جہات سے تھا

(راہی)

ان دو شعراء سے راہی کے ذہنی انسلاک کے بعد ان شعراء کے ذہنی رویئے کی طرف آتا ہوں جہاں راہی کی ہم عصریت اور ہم سری جدید غزل گو شعراء کے

حوالے سے معتبر ٹھہرتی ہیں۔ مثال کے طور پر بانی کے یہ اشعار دیکھیں۔

بس ایک چیخ گری تھی پہاڑ سے یک لخت
عجب نظارہ تھا پھر دھند کے بکھرنے کا

اے صفِ ابر رواں تیرے بعد
اک گھنا سایہ شجر سے نکلا

عجب نظارہ تھا بستی کے اس کنارے پر
سبھی بچھڑ گئے دریا کو پار اترتے ہوئے

نہیں ہے آنکھ کے صحرا میں ایک بوند سراب
مگر یہ رنگ بدلتا ہوا سا کچھ تو ہے

خاک وخوں کی وسعتوں سے باخبر کرتی ہوئی
اک نظر امکاں ہزار امکاں سفر کرتی ہوئی

(بانی)

اسی پسِ منظر میں راہی کے متعدد اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن میں یہ خلاصہ ہونے کا جواز ٹھہرتا ہے کہ ان کے یہاں شعری لوازمات برتنے میں کتنی وسیع النظری کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔

چوٹی تک اپکے پہنچی نہ ہوگی شعاعِ مہر
دریا اتر کے آیا نہیں کوہسار سے

شفق کا نظارہ جنہیں دیکھنا ہو
ہماری سحر شام میں ڈھل رہی ہے

پانی کی ایک بوند بھی پہنچی نہ حلق تک
دریا بہ لب رہا مرا دشتِ انا تمام

پتھروں کا وہ پہاڑوں سے سرکتے رہنا
میرا رک رک کے وہ منہ راہ کا تکتے رہنا

درج بالا اشعار غلام مرتضیٰ راہیؔ کے ہیں جو باقیؔ کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہیں لیکن ایک جداگانہ اسلوب کی اثر کاری سے غزل کی نئی سمت کا پتہ ضرور دیتے ہیں۔اسی طرح زیب غوری کے بھی ذہن ومزاج کی عکاسی کرنے والے چند ایسے اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں جو ہم عصریت کے لحاظ سے راہیؔ کے اشعار کی طرح اعتدال روی کو ظاہر کرتے ہیں۔مثال کے طور پر

یہ ڈوبتی ہوئی کیا شئے ہے تیری آنکھوں میں
تیرے لبوں پہ جو روشن ہے اس کا نام ہے کیا
میں راکھ ہو گیا دیوارِ سنگ تکتے ہوئے
سنا سوال نہ اس نے کوئی جواب دیا

(زیب غوریؔ)

اک آبشار سرِ کوہسار نکلا ہے
اک ایک سنگ کے دل کا غبار نکلا ہے
ہوا ہوں جب سے میں صحرا کی وسعتوں میں گم
غبار اٹھا ہے نہ کوئی سوار نکلا ہے

(راہیؔ)

مصورؔ سبزواری نہ صرف راہیؔ کے ہم عصر ہیں بلکہ مضامین کو یکساں طور پر باندھنے میں بھی ایک دوسرے کے قریب نظر آتے ہیں۔جیسے

مری شکست پہ اس نے بھی توڑ دی تلوار
اسے بھی عظمتِ دشمن کا اعتراف ہوا

ذرّہ ذرّہ تو سمیٹے ہوئے پھرتا ہے مرا
میں کہ اس ڈھیر میں خود آگ لگانا چاہوں

(مصورؔ سبزواری)

لگے تھے آگ کے انبار مرے چاروں طرف
عجیب آگ تھی مجھ میں کہ میں دبا نہ سکا
اگلا سا مجھ میں شوق شہادت نہیں اگر
پہلی سی کاٹ بھی تری تلوار میں نہیں

(غلام مرتضیٰ راہیؔ)

ہندوستان میں ان کے دیگر معاصرین میں بشر نوازؔ، بشیر بدر، نشتر خانقاہی مزاجاً الگ طبیعت کے شعراء ہیں لیکن موضوعات کو مشترکہ طور پر برتنے کی وجہ سے ان کے بیچ ذہنی قربت کا احساس ہوتا ہے۔مثال کے طور پر بشیر بدر کے یہ اشعار ؎

برف کے پھولوں سے روشن ہوئی تاریک زمیں
رات کی شاخ سے جیسے مہ و اختر برسے
خوبصورت اداس خوف زدہ
وہ بھی ہے بیسویں صدی کی طرح
سب کھلے ہیں اسی کے عارض پر
اس برس باغ میں گلاب کہاں

(بشیر بدرؔ)

اب غلام مرتضیٰ راہیؔ کے وہ اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن میں جمالیات بھی ہے اور فکر انگیزی بھی۔ یہ دیگر بات ہے کہ دونوں کا پس منظر جدا ہے لیکن یہ طے ہے کہ اس سے ان معاصرین کی سوچ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

ستارے چاند سورج کہہ رہے ہیں
چلے آؤ جہاں تک روشنی ہے
بچھڑ گئی تھی یہ ملنے کے بعد ہی ہم سے
ہم اپنی زندگی کو روئے دھوئے بیٹھے ہیں
جس طرح میرے خوابوں میں آتا ہے تو اکثر
اک بار کہیں واقعی آتا ترا یوں ہو

(راہیؔ)

پاکستان کے ظفر اقبال نے نئی اردو غزلیہ شاعری کو متاثر کیا ہے۔ سب سے بڑی بات ان کے یہاں Diction کا پیدا ہونا ہے۔ بڑی شاعری میں ڈکشن پیدا ہونا اسکے ارتقائی سفر کی آخری نشانی نہیں ہوتی بلکہ اس سے ٹھہراؤ پیدا ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ راہیؔ بھی اس منزل سے گذر چکے ہیں۔ مضمون کو باندھتے وقت ان کا مخصوص ڈکشن مترشح ہو کر شور مچاتا ہے کہ میں راہیؔ کی تخلیق ہوں۔ حوالے کے طور پر دونوں شعراء کے اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

کئی دن سے یہ کیسے آئینے میں آ رہا ہوں
مجھے دیکھو میں اپنے آنسوؤں میں آ رہا ہوں
کاغذ کے پھول سر پہ سجا کر چلی حیات
نکلی برونِ شہر تو بارش نے آ لیا

(ظفر اقبالؔ)

رہے گا آئینے کی طرح آب پر قائم
ندی میں ڈوبنے والا نہیں کنارہ مرا

قریب جتنی مرے شامِ زندگی آئی
دھند لکے اور بڑھے اور روشنی آئی

(غلام مرتضیٰ راہی)

نہیں دیکھا گیا جی بھر کے اُس کو
گِلہ ہے دل کو آدابِ نظر سے
غرض کچھ اس سے نہیں ذوقِ جستجو سے ہے
وہ سروِ ناز وہ آرامِ جاں مِلے نہ ملے

(سیّد امین اشرف)

کیسے جی بھر کے دیکھیے اس کو
دیکھنے میں کمی سی رہتی ہے
گہرائی سے دریا کی سروکار ہے مجھ کو
مٹھی میں مری کوئی گُہر آئے ،نہ آئے

(غلام مرتضیٰ راہی)

بشر نواز کی شاعری کی گونج دور سے ہی سنائی دیتی ہے۔ بلند بانگ لہجہ ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ مضامین باندھنے کا سلیقہ انہیں دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔ راہی سے ذہنی مواصلت قائم کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ دونوں ہی زوال آمادہ معاشرے کے ترجمان ہیں۔ مثال کے طور پر

بے سمت منزلوں کا سفر درمیان ہے
رستوں کے سب نشان اُڑا لے گئی ہوا
نظموں غزلوں کے پردے میں اپنا پتہ رکھ جاتے ہیں
شہرِ ادب میں یارو ہم بھی ایک دیا رکھ جاتے ہیں

(بشر نواز)

پلٹ کے جب تلک میں اس پر نگاہ ڈالتا
ہوا کا زور میرے پاؤں کا نشان لے اُڑا
وہ ہواؤں سے بھڑک اُٹھنے کا اندیشہ مجھے
وہ مرا شب میں چراغوں کو بجھا کر رکھنا

(غلام مرتضٰی راہیؔ)

نئی غزلیہ شاعری میں نشتر خانقاہی نے اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ تحیّر خیزی کے باب میں ان کا نام روشن ہے۔اس ضمن میں بھی راہیؔ کے یہاں کافی مواد بکھرے پڑے ہیں۔مثال کے طور پر۔

میں گھر بنا کے سمندر کے بیچ سویا تھا
کھلی جو آنکھ تو شعلوں میں تھا مکان مرا

(نشتر خانقاہیؔ)

بجھا کے سویا تھا میں ایک اک چراغ مگر
کھلی جو آنکھ تو جلتا ہوا مکان ملا

(غلام مرتضٰی راہیؔ)

پرکاش فکری نئی غزلیہ شاعری کے اہم دستخط ہیں۔جدیدیت کے فروغ میں خصوصی طور پر اس کے ارتقا پذیر ہونے میں پرکاش فکری کی عظیم خدمات ہیں۔فکریؔ اور راہیؔ دونوں کے یہاں اسلوب اور لہجے کی مماثلت سے قطع نظر موضوعات کو مختلف ڈھنگ سے برتتے ہوئے بھی یکساں طور پر رسائل کے صفحات پر نظر آتے ہیں۔مثال کے طور پر

وہ عکس عکس چٹانوں کا آئینہ نکلا
مجھے وہ شخص اجالے میں جب نظر آیا

ساحل کی نگاہوں میں کوئی درد ہے ایسا
موجوں کو مری ناؤ ڈبونے نہیں دیتا
(پرکاش فکریؔ)

عکس تغیرات سرِ آئینہ نہ پوچھ
تھی مجھ میں تابِ دید جو میں دیکھتا رہا
سمندر جہاں لاپتہ ہو رہا ہے
جزیرہ وہیں رونما ہو رہا ہے
(غلام مرتضٰی راہیؔ)

راہیؔ کے ان معاصرین سے تقابلی مطالعہ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ راہیؔ اپنے معاصرین میں بھی ان شعراء کی طبیعت سے ہم آہنگی برقرار رکھتے ہیں جو رجحان ساز (Trend Setler) کہلا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن نے صحیح طور پر لکھا ہے کہ ''اس شان کی غزل لکھنے والے اردو میں انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں'' انگلیوں پر گنے جانے سے مراد وہ مخصوص شعراء ہیں جنکے یہاں راہیؔ جیسی متوازی شاعری کی رمق موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ ان شعراء کا بھی ڈانڈا کسی نہ کسی طرح غالبؔ سے ملتا ہے اور راہیؔ کا بھی۔ غالب کے وسیلے سے اور راہیؔ کے ساتھ ان کے معاصرین کے تقابل سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ غلام مرتضٰی راہیؔ احساس و ادراک کو بروئے کار لانے والے ایسے شاعر ہیں جنہیں ہم جینئس (Genious) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ Genious ہونے کی عظمت راہیؔ کے پختہ کار ذہنی عصری صداقت کا عرفان حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ طبیعت کی ذکاوت نے انہیں غزل کے اہم شاعر کے منصب پر فائز کیا ہے۔ اس لئے میں اپنے مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ غلام مرتضٰی راہیؔ ایک رجحان ساز جدید شاعر ہیں۔

اب میں غلام مرتضٰی راہیؔ کی غزلیہ شاعری کو بغیر متقابل مطالعے کے پیش کرنا

چاہتا ہوں۔ جدید غزل گویوں میں راہیؔ کے مقام کا تعین کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کی غزلوں کے اشعار کے ارتقائی منزل کو ذہن میں رکھا جائے۔ اُن کی غزلوں کے بیشتر اشعار میں یادوں کی دبیز پرچھائیں راہیؔ کا پیچھا کرتی ہیں۔ اور شدّت احساس سے مغلوب ہو کر اس طرح کے شعر کہتے ہیں۔

کاریگری دکھا کے میں ہوجاؤں گا الگ
لڑتا رہے گا آخری پتہ ہواؤں سے
نظر میں رکھتے ہیں انجام ابتداء سے ہی
تماشہ دیکھنے والوں میں اہل فن ہیں بہت
جان رہتی ہے تو ایمان چلا جائے گا
چاہتا یہ ہوں کہ دونوں کی حفاظت کرلوں

محولہ اشعار 'لاریب' کے ہیں۔ ان اشعار میں راہیؔ کی طبیعت کی ماجرا سازی ہے جو ہمیں پڑھنے کے بعد چونکنے پر مجبور کرتی ہے۔ دراصل شاعر نے پیکر تراشی کے ذریعہ شعر کی عمارت کھڑی کر لینے کا جو ہنر حاصل کیا ہے وہ خود ساختہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ ہر چند کہ 'لامکاں' ۱۹۷۱ء میں اور 'لاریب' ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا لیکن ذہنی طور پر راہیؔ 'لاریب' میں زیادہ Matured ہو کر سامنے آتے ہیں۔ ان کی ذہنی پیش رفت کو سمجھنے کے لئے 'لامکاں' کے اشعار کو ذہن میں رکھنا ضروری ہوگا۔ اس لئے کہ کج ہو دیوار تو پھر سب کی نظر پڑتی ہے کے مصداق راہیؔ کے افکار و خیالات میں ہونے والی نمایاں تبدیلی کا اندازہ لگانے کے لئے اس مجموعے کے اشعار کی قرأت ضروری ہے۔

کوئی صحرا ہے گھنے جنگل کے بعد
کھل رہا ہے ایک روشن باب سا

تلے تھے زباں کھینچ لینے پہ سب
مگر میں ترا نام لے کر رہا
ہم لوگ پی کے بیٹھ گئے ایک سانس میں
کوزے میں اب کسی کے سمندر نہیں رہا

محولہ اشعار پیش کرنے کی غرض وغایت یہ ہے کہ راہیؔ مضمون کے بطن سے مضمون پیدا کر لینے کا ہنر جانتے ہیں۔'لامکاں' میں یہی وصف ان کی شناخت کا ذریعہ بن گیا ہے۔جنگل کے بعد صحرا کے وجود کی امید کا باب کھلنا اور واجب سرکشی کا ایسا برملا اظہار کہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔تیسرے شعر میں عام طور پر سمندر کو کوزے میں بند کرنے کا محاورہ دہراتے رہے ہیں لیکن راہیؔ نے حد درجہ کمال کا مظاہرہ کر دکھایا ہے کہ مضمون آفرینی یوں کی جاتی ہے۔پوری رمزیت کو ایک مصرعے میں ''ہم لوگ پی کے بیٹھ گئے ایک سانس میں'' پیش کرنے کا سلیقہ صرف راہی کے پاس ہے۔

اکثر جدید شعراء یہاں معنوی اعتبار سے دولخت نظر آتے ہیں۔دولخت سے مراد یہ ہے کہ کبھی کبھی شاعر پوری بات ایک مصرعہ میں کہہ کر چپ ہونے کا جواز فراہم کرتا ہے لیکن دوسرے مصرعہ میں اگر موزوں پیوندکاری نہیں ہو پاتی ہے تو شعر اپنا بھرپور لطف کھو دیتا ہے۔راہی کا اس ضمن میں ٹریٹمینٹ مختلف ہے۔پہلے مصرعے میں مضمون کو ادھورا چھوڑ دینے کا احساس وہ شروع میں ہی دکھلا دیتے ہیں۔اور ان کا قاری دوسرے مصرعے کے کردار پر نظریں جمائے رکھتا ہے۔جب مکمل بات پیش کرنے کی نوبت آتی ہے یعنی راہی جب دوسرا مصرعہ شعر مکمل کرنے کے لئے کہتے ہیں تو شعر کا چہرہ خوش گوار حیرت سے کھل جاتا ہے۔مثال کے طور پر درج ذیل اشعار اس ضمن میں پیش کئے جاتے ہیں۔

اب آگے اُس کے قدم کے نشاں نہیں ملتے
پیادہ جانے یہاں سے سوار کیسے ہوا

نہ دی زباں کو کبھی میں نے جنبشِ اظہار
نہ آنسوؤں کو کیا عرض حال پر مامور

چھپا تھا ہیرا کوئی راستے کے پتھر میں
ہماری ٹھوکروں نے اس کا انکشاف کیا

سورج ڈھلا تو دھوپ جڑوں تک پہنچ گئی
شام آئی تو درختوں سے سایہ نہ ہو سکا

پھینکنے والوں نے پہچان نہ جانی انکی
جُڑ گئے ہیں میری دیوار میں پتھر کیا کیا

درج بالا اشعار میں چند کی تشریح کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پہلے شعر میں بڑی پُر اسراریت ملتی ہے۔ پُر اسراریت کو میں حیرت خیزی پر بھی محمول کر سکتا ہوں لیکن پُر اسراریت زیادہ موزوں رہے گی۔ اس لئے کہ نفس مضمون اسی رتبے کو پہنچتا ہے۔ راستوں کے نشان کے کھو جانے کو گم شدگی کے نوحے سے تعبیر کر کے ہم مطمئن نہیں رہ سکتے کیونکہ فرد جب پہلے سے بھیڑ میں گم ہے تو پھر راستے کی بازیافت کی نوحہ گری کیسی؟ لیکن جدید شاعری کی ایک سمت بتاتی ہے منزل کی گم شدگی میں نامعتبر راستے زیادہ ذمّہ دار رہے ہیں۔ ہمیں یہ بھی ذہن میں رکھنا ہے کہ رستے کے سب نشانات کو صرف ہوا ہی نہیں اُڑا لے جاتی ذہن و دل کے اندر چلنے والی آندھی میں ہم بے پر اُڑے چلے جاتے ہیں۔ اس لئے نہ ہمیں محفوظ رستے کا عرفان ہوتا ہے اور نہ منزل سے آگاہی۔ غلام مرتضیٰ راہی نے اپنی پُر اسراریت سے اس قسم کا سوالیہ نشان چھوڑا ہے۔ راہی کا کمال ہے کہ بہت سارے سوالات کا جواب وہ خود قارئین بالخصوص سمجھدار شعر فہم سے چاہتے ہیں۔ دوسرا شعر بیانیہ انداز کا ہے۔ لیکن راہی کے طرزِ تخاطب کی چغلی کھا رہا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے یہاں سہل پسندی کا ثبوت فراہم کیا ہے جب کہ ایسا نہیں ہے۔ زباں کو اظہار کی جنبش

نہیں دینا اور آنسوؤں کو عرض حال پر مامور نہ کرنا حالانکہ خلافِ فطرت نہیں ہے لیکن اس کا انکشاف ہی اتنے موثر پیرائے میں ہوا ہے کہ داد خواہی کی طلب شرمندہ نہیں ہو سکتی۔

ہم پہلے بھی اپنے اس مضمون جس میں راہی کی انفرادیتِ کلام کو پیش کیا ہے۔وہاں ہم نے کہا ہے کہ یہ سامنے کی چیز اور معمولی حیثیت کی شئے سے واسطہ پیدا کر کے بیش قیمت جواہر پارے اکٹھے کر دیتے ہیں۔ یہ جواہر پارے ان کے آنسوؤں کی چمک سے بھی پیدا ہوتے ہیں۔اور جرأت آمیز ٹھوکر سے بھی۔ان کے اس انداز پیشکش سے صلہ رُحمی کی التجا نہیں ملتی بلکہ حالات کے گمبھیر ہونے کے خدشات پیدا ہوتے ہیں۔ نئ شاعری میں سورج، دھوپ، پیڑ چھاؤں جیسے الفاظ کا ڈھیر لگا دیا گیا ہے۔لیکن راہی کے یہاں ان الفاظ کا فیشن زدہ اظہار دیکھنے کو نہیں ملتا ہے۔چوتھے شعر میں صبح میں پیڑ کی دھوپ سے محرومی اور شام ہونے پر درختوں کے ذریعہ سایہ نہ ہونے کا جو ملال پیش کیا گیا ہے وہ لہجے میں رقت آمیزی پیش کرنے کے لئے کافی ہے۔

اب میں لوٹ کر پھر اسی نکتے پر آتا ہوں کہ عوامی بے خبری اور اس کے ردّعمل میں راہی نے جو پُر لطف اشاریہ پیش کیا ہے وہ مشاہدے کی حساس آنکھ کی بصیرت پر دال ہے۔ان سطور کو لکھنے کا مقصد غلام مرتضٰی راہی کا جدید غزل گویوں میں مقام وہ منصب پر فائز کرنے کے پہلے ان کے اشعار کے حوالے سے علٰیحدہ علٰیحدہ خصوصیات کی درجہ بندی کی گئی ہے تاکہ بغیر متقابل مطالعے کے بھی راہی کی غزلیہ شاعری کے اشعار کی نفسیات کو مکمل طور پر واضح کیا جا سکے۔راہی کی غزلوں کے محولہ اشعار ان کے افکار و خیالات کے ارتقا کی نشاندہی بھی کرتے ہیں اور فکر کی نئ جہت تلاش کرنے میں معاونت بھی کرتے ہیں اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ راہی کا جدید غزل گویوں میں ارفع و بلند مقام ہے۔

****

باب نمبر۔۹

برآمد نتائج

''**غلام مرتضٰی راہیؔ ۔۔ حیات اور کارنامے**''میری تحقیق کا موضوع ہے جو دس ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں ان پر تفصیلی مواد کی یکجائی کی گئی ہے۔تعارف کے باب میں حتی الامکان میں نے کوشش کی ہے کہ شاعر موصوف کا روایتی تعارف کے ساتھ ساتھ ان کے آباواجداد کی روحانی اور ادبی پسِ منظر کو بھی شریک مطالعہ کیا جائے۔اس کے بعد ہی انکی شاعری کے حسین روایتی اقدار کا احاطہ کر کے ترقی پسندی سے جدیدیت تک انکی فطری رسائی کو زمانہ وار ذہنی ارتقا کو بھی زیر بحث لایا جاسکا ہے۔

سوانحی خاکہ میں وہ ساری باتیں آگئی ہیں جو غلام مرتضٰی راہیؔ کے خاندانی شجرے سے تعلق رکھتی ہیں۔اور انکی اب تک کی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات وسانحات کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔

''غلام مرتضٰی راہیؔ اور اردو غزل کی روایت'' میں باالتفصیل یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ راہی اردو غزل کی حسین روایت کے پاسدار ہیں ان کے یہاںؔ روایت کا تصور بے حد پاکیزہ اور مثالی ہے۔فنّی شعور کی آگاہی کے حوالے سے راہی کے مختلف جہات کے مطالعے کا یہ باب بے حد دلچسپ ہو گیا ہے۔

''جدّت اور جدیدیت'' کے موضوع پر بحث کرنے والے اکثر لوگ مغالطے

کا شکار ہو جاتے ہیں اور دونوں صورت حال کو ایک ہی چیز سمجھ بیٹھتے ہیں جدّت اور جدیدیت کی تفریق حوالوں سے اور اشعار کی پیشکش سے بے حد آسان فہم لہجے میں اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ جدّت، فن، اسلوب، لہجے اور اندازِ پیشکش میں پیدا کی جا سکتی ہے۔ جدّت پسندی ایک جبلّی انفرادی شعور ہے جس میں بلا کی کشش ہوتی ہے۔ یہ لاشعوری ہوتی ہے اور فن کے معیار کو بلند کرتی ہے۔ جدیدیت ایک ٹرمولاجی ہے جو ادب کی بدلتی ہوئی قدروں کی زمانہ وار تقسیم سے عبارت ہے۔ جدیدیت، ترقی پسندی کے بعد کے عہد کا منظر نامہ ہے۔ جدیدیت کے کئی چہرے ہیں یعنی اسکی کئی جہتیں ہیں ۱۹۶۰ء میں مغربی لہر ہندوستان میں آئی جس نے فرد پسندی کو فروغ دیا۔ ہپی ازم دراصل مغرب سے درآمد ایک ایسی بین الاقوامی سماج کی لہر تھی جس میں بال بڑھانا فیشن بن گیا تھا۔ نشہ آور گولیاں کھا کر غم غلط کرنے، ہرے کرشنا ہرے رام کی رٹ، اور وجودیت کے استحکام کی ایک دانشورانہ مہم شروع ہوگئی تھی ظاہر ہے کہ اس کا اثر بھی غیر براہ راست طور پر ادب پر پڑنا ضروری تھا۔ فنون لطیفہ میں شاعری بھی ایک اہم فن ہے جو فنّی شعورِ فکر کی روشنی میں جب نہاتی ہے تو اس کا چہرہ تخلیق کا لباس پہن لیتا ہے۔ جدیدیت میں بھی دو طرح کی روایتیں قائم کی گئیں۔ پہلی صالح جدیدیت اور دوسری فیشن زدہ اور ابہام اہمال سے پُر جدیدیت۔ آخر الذکر جدیدیت سے شعوری طور پر کنارہ کشی اختیار کرنے والوں میں غلام مرتضیٰ راہی کا بھی ایک نام ہے۔ یعنی یہ ایک صالح جدیدیت کے علمبردار رہے ہیں۔ انکی صالح جدیدیت پسندی کے نمونے مفصل طور پر انکے اشعار کے حوالے سے بیان کئے گئے ہیں۔

’’تشبیہات و استعارات‘‘ برتنے میں راہی اپنے معاصرین میں اس معنی میں منفرد ہیں کہ یہ بھاری بھر کم عربی یا فارسی آمیز لفظیات کی پیش کش کو روا نہیں رکھتے ہیں۔ یہ اس امر میں یقین رکھتے ہیں کہ سامنے کی چیز سے بھی ٹھوکر لگنے سے آدمی گر سکتا

ہے یعنی اسے پہاڑ سے ٹکرانے کی ضرورت نہیں ہے۔استعارہ سازی میں نثریت کو فروغ دینے والوں میں راہیؔ نہ صرف اپنے معاصرین میں ممتاز نظر آتے ہیں بلکہ آنے والی نسل کے لئے بھی نشانِ راہ بن کر ابھرتے ہیں۔اس ضمن میں متعدد اشعار کے حوالے متعلقہ باب میں دیئے گئے ہیں جسے پڑھ کر انکی طبیعت کی سادگی میں دشواری تلاش کی جاسکتی ہے۔

معاصر غزل میں راہیؔ کا مقام کیا ہے یہ ایک اہم سوال ہے مختلف کتب، رسائل وجرائد کے صفحات اس کے گواہ ہیں کہ راہی کے یہاں 'نکیلاپن' کی خصوصیت موجود ہیں۔شہریار، خلیل الرحمٰن اعظمی سے لیکر عشرت ظفر اور رونق شہری تک نے راہی کی انفرادیت کو تسلیم کیا ہے اور جدید غزل میں انکے قابل لحاظ سرمائے کی قدر و قیمت کا موازنہ کرتے ہوئے بانیؔ سے زیادہ معتبر قرار دیا ہے۔

معاصر غزل گو میں جہاں تک راہیؔ کے مقام کے تعین کی بات ہے راہیؔ کا منصب اپنے معاصرین میں ہم سری کا مطالبہ نہیں کرتا ہے۔ بلکہ تقابلی مطالعہ کے لئے راہیں ہموار کرتا ہے اسلئے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ راہیؔ کو غالبؔ کی ذہنیت سے علاقہ رکھنے والا شاعر قرار دیتے ہوئے بانیؔ، زیب غوریؔ، مصور سبزواری کی صف میں انہیں رکھا جائے۔شعری مبادیات کے اعتبار سے چونکہ ان کے یہاں عصری چالاکی کے نمونے بہت کم ہیں اس لئے ان کا امیج تخلیقیت سے ہم آہنگ شاعر کا بنتا ہے۔اس امیج کو بنانے میں راہی کو جن خاردار رہگذر سے گذرنا پڑا ہے وہ تفصیلی طور پر میرے تحقیقی مقالے کے کئی ابواب میں مرکوز ہے۔اس لئے حتمی طور پر میری تحقیق کا ماحصل درج ذیل نکات ہیں۔

ا۔ غلام مرتضیٰ راہیؔ کی غزلوں میں اپنے معاصرین کے برتے ہوئے موضوعات سے پرہیز کرنے کا طبعی رجحان ملتا ہے۔

۲۔ غلام مرتضیٰ راہیؔ کی شاعری میں دانشوری کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ وہ خیال اور صورت الخیال کے مابین بڑی فنکاری سے تمیز کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

۳۔ انکا شعرا کھرے اور روکھے پن کے عیب سے پاک ہے۔ شعری مواد کی فراہمی کا وسیلہ ان کے گرد وپیش کا ماحول ہے۔ زمان ومکان کا یکساں درک رکھنے کے باوصف ہر شعر میں ان کی اپنی شمولیت منعکس ہوتی ہے۔

۴۔ مشاہدہ اور مطالعے کا حسین امتزاج ان کی شاعری میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

۵۔ موضوعات کو اچھوتا پن کے ہنر سے متصف کرنے کے لئے ان کی اپنی شعری کاریگری کی داد نہ دینا بخل میں شمار ہوگا۔

۶۔ جدیدیت میں ایک بھیڑ چال موجود رہی ہے۔ راہیؔ اس قافلہ کے شروع سے ہی نام نہاد قائد نہیں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ متنازعہ فیہ امور میں راہیؔ کا نام کہیں نہیں آتا۔ صرف تخلیقی شاعر کی حیثیت سے انکی موجودگی ظاہر ہوتی ہے۔

۷۔ دنیائے شاعری میں دو شعراء ایسے ہیں جن کے یہاں شروع سے ہی تازہ دمی کا احساس ہوتا ہے۔ ایک مظفر حنفی اور دوسرے غلام مرتضیٰ راہیؔ۔

۸۔ اُٹھ اُٹھ کر سنگ اور خشت کا سلام کرنا، آئینوں کا حقیقت سے مکرنا، کنارے کا سب سے پہلے ڈوبنا، ڈوبنے کے لئے دریا کو سمندر نہ ملنا، جنگ کے خاتمے کے بعد ہتھیار موجود لیکن لشکر کا نہ ملنا، دریا کا قطرۂ ناچیز کو عبور کرنا راہیؔ کی معنی آفرینی کے ایجاد انگیز طریقے ہیں جو پوری اردو شاعری میں عنقا ہے۔

۹۔ راہیؔ کی شاعری کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ان کی زبان تربیت یافتہ ہے۔ مروجہ محاورات کو اپنی طبیعت کے حوالے سے برتنے کے انوکھے ذائقے سے لطف اُٹھانا ہو تو راہیؔ کے غزلیہ اشعار کی قرأت کرنی چاہیئے۔

۱۰۔ غلام مرتضیٰ راہیؔ کے یہاں ایک لفظ کی مترادفات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

اسی لئے وہ جب اور جیسا چاہتے ہیں کلام کو مقفع مسجع کئے بغیر وجدان کا حصہ بنا دیتے ہیں۔

۱۱۔ راہیؔ کے کلام کو سمجھنے کے لئے ان کے پرواز تخیل کی رفتار پر نظر رکھنا مشکل ہے۔ کیونکہ بالکل سامنے کی چیز سے بھی وہ صرف نظر نہیں کرتے اور آسمانی تحیر کا بھی انکشاف بیک وقت کرتے ہیں۔

۱۲۔ بحور واوزان پر قدرتِ کاملہ کا اظہار کئی صورتوں میں کرتے رہتے ہیں۔اس سے ان کی دقت نظری سب پر عیاں ہے۔

۱۳۔ غزل کو نئی لے نیا آہنگ دینا معمولی درجے کے شاعر کے بس کا روگ نہیں ہے۔سبھی جانتے ہیں کہ راہیؔ کی غزلوں میں مستور نغمگی ،صوتی خوش آہنگی کی فضا کو تخلیق کرنے میں معاون ہیں۔

۱۴۔ راہیؔ کے ہاتھ سے گیلی مٹی کے تودے کون سی شکل اختیار کریں گے یہ ناظر کی نگاہ میں نہیں آسکتا۔لفظی الٹ پھیر سے مرتب ایک شعر کارخانۂ قدرت میں برپا شور کو نمایاں کرنے کے لئے کافی ہے۔آسمانوں سے فرشتوں کا جھانکنا اور ایک بچے کا ہاتھ میں شیشہ لئے رہنا خدائی اور معصوم بندگی کے ہفت رنگ مناظر کو پیش کرتا ہے۔

۱۵۔ راہیؔ غالبؔ کی ذہنیت سے تعلق رکھنے والے شاعر ہیں۔

۱۶۔ راہیؔ روایت کے حسین تصور کو برتنے والے شاعر ہیں۔

۱۷۔ راہیؔ کے یہاں فرسودہ تشبیہ واستعارات اور یکسانیت نہیں ہے۔

۱۸۔ راہیؔ کا کلام مطالعے کی عمیق گہرائی وگیرائی نیز مشاہدے کی رمق کو روشن کرتا ہے۔

۱۹۔ راہیؔ کا امیج جدید غزل گویوں میں پسندیدہ ہے۔

۲۰۔ راہیؔ کا شعری سرمایہ اہم جدید غزل گویوں میں بشمول بانیؔ زیادہ ہے۔

۲۱۔ راہیؔ کو غالبؔ کی ذہنیت سے علاقہ رکھنے والا شاعر قرار دیتے ہوئے بانیؔ، زیب غوری اور مصور سبزواری کی صف میں رکھا جانا چاہیے۔

۲۲۔ غلام مرتضیٰ راہیؔ کی شاعری کی چھاپ مابعد جدید شعراء پر زیادہ نظر آتی ہے۔

۲۳۔ راہیؔ کے حوالے کے بغیر نئی غزل کی تاریخ مرتب نہیں کی جا سکتی۔

۲۴۔ راہیؔ شناسی کے باب میں میری یہ تحقیق آنے والی نسل کے لئے شمع راہ ثابت ہو سکتی ہے۔

****

باب نمبر۔۱۰

بائبلیو گرافی

مصنف	کتاب	نمبر
غلام مرتضٰی راہی	لامکاں	۱۔
غلام مرتضٰی راہی	لاریب	۲۔
غلام مرتضٰی راہی	حرف مکرر	۳۔
غلام مرتضٰی راہی	لاکلام	۴۔
غلام مرتضٰی راہی	لاشعور	۵۔
غلام مرتضٰی راہی	سدابہار غزل	۶۔
غلام مرتضٰی راہی	راہی کی سرگزشت	۷۔
عشرت ظفر	حرف باریاب (راہی کی غزل کا تنقیدی مطالعہ)	۸۔
جمیل جالبی	تاریخ ادب اردو	۹۔
علامہ اقبال	بالِ جبریل	۱۰۔
کلیم الدین احمد	اردو تنقید پر ایک نظر	۱۱۔
حکیم سید عبدالحی	گلِ رعنا	۱۲۔
ڈاکٹر وہاب اشرفی	آگہی کا منظر نامہ	۱۳۔
رشید احمد صدیقی	آشفتہ بیانی میری	۱۴۔
ڈاکٹر سید اعجاز حسین	مختصر تاریخ ادب اردو	۱۵۔

نمبر	کتاب	مصنف
۱۶۔	دھوپ کی سرحد	اسعد بدایونی
۱۷۔	آزادی کے بعد اردو غزل	بشیر بدر
۱۸۔	عکس آئینہ	غوث محمّد غوثی
۱۹۔	صدائے عرش گیر	امانت اللہ اسیر
۲۰۔	سرابوں کی فصل	جمنا پرشاد راہی
۲۱۔	گردش رنگ	مختار ہاشمی
۲۲۔	زمین خاموش ہے	رئیس الدین رئیس
۲۳۔	شاخ لرزیدہ	اندر سروپ سریواستو
۲۴۔	انور شیخ بحیثیتِ شاعر	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
۲۵۔	مثنوی وقت	صفوت علی صفوت
۲۶۔	مثنوی رسول	صفوت علی صفوت
۲۷۔	سوادِ حور	صفوت علی صفوت
۲۸۔	ریگِ رواں	سعید الظفر وسیم
۲۹۔	حرف رواں	سعید الظفر وسیم
۳۰۔	غزل کا نیا منظر نامہ	شمیم حنفی
۳۱۔	جدیدیت کی جمالیات	لطف الرحمٰن
۳۲۔	جادۂ شب	سیّد امین اشرف
۳۳۔	انواک	ڈاکٹر اوم پرکاش اوستھی
۳۴۔	کلام راہی اور صنائع و بدائع	محمد ادریس رضوی (ایم۔اے۔)

رسائل

۱۔	ماہنامہ 'آج کل' دہلی	ـ	جنوری	۱۹۸۲ء
۲۔	پگڈنڈی، امرت سر	ـ	مارچ	۱۹۶۶ء
۳۔	نیا دور، لکھنؤ	ـ		۱۹۶۶ء
۴۔	شاعر، بمبئی	ـ	فروری	۱۹۶۵ء
۵۔	جانثار، امرت سر	ـ	سالنامہ	۱۹۶۸ء
۶۔	شاخ سار، کٹک	ـ	دسمبر	۱۹۶۶ء
۷۔	روزنامہ پیغام، کانپور	ـ	۱۰ رمئی	۱۹۶۶ء
۸۔	خاتون دکن، حیدرآباد	ـ	ستمبر	۱۹۶۷ء
۹۔	حریم، لکھنؤ	ـ		۱۹۶۶ء
۱۰۔	روزنامہ سیاست جدید، کانپور	ـ		۱۹۶۹ء
۱۱۔	سہ ماہی 'رنگ' دھنباد	ـ		۲۰۰۶ء
۱۲۔	سہ ماہی اسباق، پونہ	ـ	جنوری تا دسمبر	۲۰۰۶ء
۱۳۔	شب خون، الہ آباد	ـ	اپریل ۶۸ء تا دسمبر ۲۰۰۵ء (مختلف شمارے)	
۱۴۔	سفیر اردو، کراچی	ـ	جولائی	۲۰۰۳ء
۱۵۔	لبرٹی، کارڈف (انگلینڈ)	ـ	اکتوبر تا دسمبر	۱۹۹۷ء
۱۶۔	کتاب لکھنؤ	ـ	۱۹۶۶ء تا ۱۹۷۲ء (مختلف شمارے)	
۱۷۔	تحریک، دہلی	ـ	" " " "	
۱۸۔	شعر و حکمت، حیدرآباد	ـ		۱۹۷۲ء
۱۹۔	آہنگ، گیا	ـ	۱۹۶۸ء تا ۱۹۷۱ء (مختلف شمارے)	

****

GHULAM MURTAZA RAHI
HAYAT AUR KARNAME

by

Dr. Hasan Nizami



ڈاکٹر حسن نظامی

غلام مرتضیٰ راہی

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com

978-93-5073-050-2